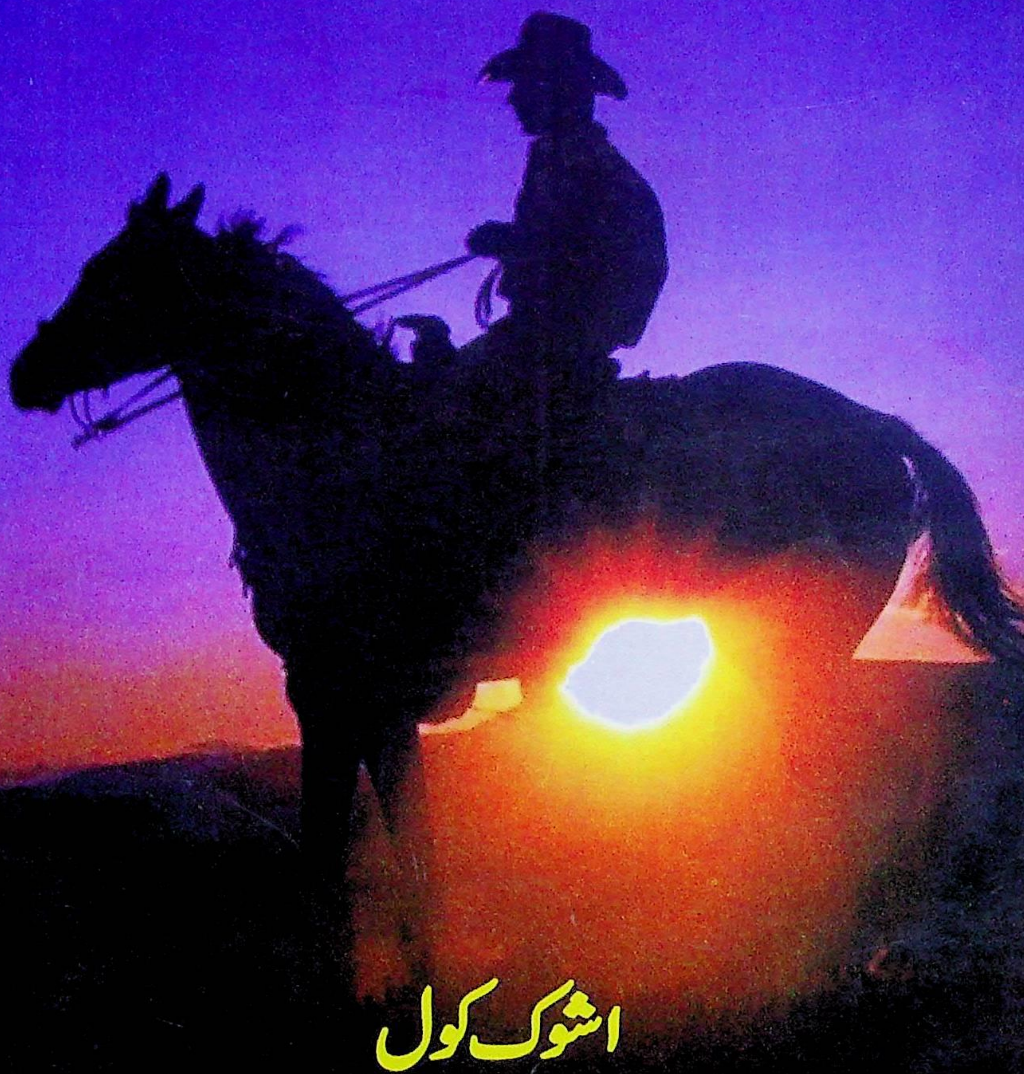
میری روٹی کہاں ہے؟

(ناول)



اشوک کول

محترم کول صاحب کی
خدمت میں
بڑے ادب کے ساتھ

اشوک کول
فون نمبر
94191-41962

میری روٹی کہاں ہے؟

[ناول]

میری روٹی کہاں ہے؟

''تھک گئے ہو کیا؟''

''تھکی ہوئی تو تم لگ رہی ہو۔''

''نہیں لیکن دل ذرا اُداس ہے۔''

''کیوں......؟۔''

''تمہاری کہانی کی وجہ سے، تمہاری یہ کہانی ہر دل پر ہتھوڑے مارے گی۔''

''عام لوگوں کے دل پتھر کے ہوتے ہیں، ہتھوڑے اُن پر اثر نہیں کرتے ہیں۔''

''ہتھوڑے بھی تو لوہے کے ہوتے ہیں، پتھر ٹوٹ ہی جاتے ہیں اُن کی ضربوں سے۔''

اسی ناول سے ....

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

(اقبالؒ)

میری روٹی کہاں ہے؟

[ناول]

ایک سوال..........

ایک جواب..........

اُشوک کول

اشوک پبلکیشنز

دُرگا نگر، جموں

نام کتاب	: میری روٹی کہاں ہے؟
نوعیت	: ناول
مصنّف	: اشوک کول
سائز	: 18x22/8
صفحات	: 176
اشاعت اول	: فروری 2004ء
کمپیوٹر کتابت و سرورق ڈیزائن	: TFC سنٹر، مدینہ چوک گاؤ کدل سرینگر فون: 2473818
طباعت	: الحیات پرنٹوگرافرس سرینگر فون: 473818
قیمت	: =/200 روپے

ناشر

اشوک پبلکیشنز

46/2A دُرگا نگر، جموں

فون: 2593090-2506083

انتساب

اپنے

پیارے

سورگباسی

پتاجی

کے

نام

تقریظ

اشوک کول کا ناولٹ ''میری روٹی کہاں ہے؟'' اُردو اَدب میں یقیناً حوصلہ افزا اضافہ ہے۔ صاحبِ ناولٹ نے اپنی ادبی تخلیق کے لیے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے اس کا تعلق کائنات کے فرد فرد کے ساتھ ہے۔ روٹی واقعی انسان کی ایسی بنیادی ضرورت ہے جس کے حصول کے لیے حضرتِ آدم کی اولاد کیا کچھ کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ ناولٹ کی زبان بھی موضوع کی طرح دلکش اور پسندیدہ ہے۔ اُمید ہے قارئین زبان کی لطافت دیکھ کر ناولٹ کا مطالعہ کرنے میں حد سے زیادہ دلچسپی لیں گے۔

اشوک کول واقعی مبارکبادی کے مستحق ہیں جو انہوں نے یہ بہترین ناولٹ ان حالات میں قلمبند کیا جب ہماری ریاست کا فرد فرد ذہنی انتشار کا شکار رہے۔ اللہ کرے اشوک کول کو اپنے سماجی مسائل پر لکھنے کا اشتیاق اور بڑھے۔

ڈاکٹر عبدالرشید خان [گولڈ میڈلسٹ]

سربراہ شعبۂ اُردو زنانہ کالج مولانا آزاد روڑ سرینگر، کشمیر

پیش لفظ

اشوک کول کے ادبی سفر کا چاند ابھی تک گمنامی کی بدلیوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا مگر آخر کار اس کو اپنی چاندنی بکھیرنے کے لیے نمودار ہونا ہی پڑا۔ ان کا گراں مایہ سرمایہ ان کے وہ ناول ہیں، جو تعداد میں تو بیس (۲۰) ہیں لیکن ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ چھوٹی عمر میں اُردو کے چالیس ناول لکھنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ چالیس اُردو ناولوں کا مصنف ابھی تک پردۂ راز میں رہا۔ اشوک کی ادبی ریاضت اور محنت قابل دید بھی ہے اور قابل داد بھی۔ ایسے ماحول میں جہاں ہر طرف افراتفری کا عالم ہے، اشوک کا ادبی شمع کو جلائے رکھنا کوئی معمولی بات نہیں۔ خدا کرے اشوک اس شمع کو ہمیشہ فروزاں رکھنے میں کامیاب و کامران ہو۔

اشوک کول سویہ بگ بڈگام کے ایک شریف اور نیک خاندان کے

چشم و چراغ ہیں۔ مگر آج کل حالات سے مجبور ہو کر جموں میں قیام پذیر ہیں۔ اپنے آبائی وطن سے دوری اور نامساعد حالات کے باوجود اشوک پرورشِ لوح و قلم کرتے رہے ہیں۔ زیرِ نظر ناول جب میری نظروں سے گزرا تو میں بے حد خوش ہوا اور اُن کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے غیر مطبوعہ ناولوں کی اشاعت و طباعت کا آغاز اسی ناول سے کریں، جو انہوں نے قبول کیا اور اب یہ ناول آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

میں اشوک کول کو مبارکباد دیتے ہوئے دُعا گو ہوں کہ ان کا شوق پھلے اور پھولے اور یہ گُل ایک پورے گلستانِ ادب میں تبدیل ہو جائے۔

حیات احمد حیات
صدر و گدی نشین
دار الصالحین ٹرسٹ علم و ادب
این۔ ایس۔ پور (بڈگام)

نیلما نے بہت کوشش کی!

اُس نے زور سے ہارن بھی بجائی اور اپنی جیپ گاڑی کے پورے بریک بھی لگا دیئے لیکن پھر بھی وہ جیپ گاڑی کو وقت پر نہ روک سکی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ کوئی اس کی جیپ گاڑی کے نیچے آ گیا تھا۔ خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی اور تھوڑی دیر تک اُس کے کان کسی کی آہ وبکاہ سُنتے رہے۔ پھر اپنے اندر طاقت جمع کر کے اس نے باہر جھانک کر دیکھا تو وہ اور زیادہ خوف کھا کر رہ گئی۔ ایک نوجوان سڑک کے کنارے گرا ہوا تھا اور اُس کی داہنی ٹانگ پر نیلما کی گاڑی کا اگلا پہیہ رُکا ہوا تھا اور اُس نوجوان کا خون دور دور تک بہتا چلا جا رہا تھا۔ درد کی شدت سے وہ نوجوان تڑپ رہا تھا اور نیلما کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے؟ اُس نے جیپ گاڑی پھر سے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی لیکن گھبراہٹ میں وہ یہ اندازہ بھی نہ رکھ سکی کہ اُسے کب رُکنا چاہئے! وہ تب رُکی جب اُس نوجوان کی ٹانگ اس کی جیپ گاڑی کے پچھلے پہیے سے دوبارہ کُچلی جا چکی تھی۔ اُس نوجوان کی آہ وفریاد میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ نیلما فوراً اپنی گاڑی سے اُتر کر اُس نوجوان کے پاس چلی آئی۔ وہ ڈوبتا جا رہا تھا۔ ڈوبتے ہوئے وہ بولا۔

"بھاگ جاؤ ......فوراً یہاں سے بھاگ جاؤ۔

"بھاگ جاؤ......؟ نیلما نے کمال حیرت سے پوچھا۔

"ہاں...... بھاگ جاؤ...... یہ سب...... کسی نے نہیں دیکھا ہے" وہ ڈوبتا گیا۔ اُس کی

آنکھیں بند ہوتی گئیں۔ رات ہو رہی تھی اس لیے دور دور تک کوئی نہیں تھا اور نہ ہی اُس سنسان سڑک پر کسی اور گاڑی کا کوئی نشان تھا۔ نیلما نے پھر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا یا پھر وہ مر ہی گیا تھا۔ نیلما نے سوچا کہ اُسے وہاں سے بھاگ نکلنا چاہئے لیکن یہ اس کے ضمیر کو گوارہ نہ ہو سکا۔ جانے کیسے بے قابو دل کو ذرا سا قابو میں کر کے اُس نے اُس نوجوان کو چھو لیا تو اُس میں زندگی کے آثار دیکھ کر اُس کی جان میں جان آ گئی۔ اُس نے جیسے تیسے اُس نوجوان کو اپنی جیپ گاڑی میں ڈال دیا اور اُسے اپنے بھائی ڈاکٹر راہول کے اہسپتال میں لے گئی۔ وہ بہت خوفزدہ تھی اور پریشان بھی کیونکہ آج پہلی بار اُس سے ایسا حادثہ ہوا تھا۔ اُس اجنبی نوجوان کے لیے اُسے بہت تشویش ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر راہول فوراً ہی اُس نوجوان کی جانچ میں لگ گئے۔ اُسے فوری طبی امداد دے کر وہ نیلما سے بولے۔

"یہ سب کیسے ہوا؟"۔

"مجھے نہیں معلوم"۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ "میں نے بہت کوشش کی تھی لیکن......؟"۔

"تم نے بہت لاپروائی کی ہے نیلما اور تم نہیں جانتی ہو کہ تمہاری لاپروائی اس آدمی کی.........؟"

"نہیں بھیا"۔ وہ آنسوں چھلکاتے ہوئے درمیاں میں ہی بولی۔ "اِسے بچالو۔ کسی بھی طرح اِسے بچالو بھیا ورنہ میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکوں گی۔

"مارنے یا بچانے والا میں کون ہوتا ہوں نیلما لیکن یہ آدمی بچ بھی گیا تب بھی تم خود کو کبھی معاف نہ کر سکو گی۔ پوری زندگی یہ اجنبی تمہارے سامنے روتا بلکتا کھڑا ہو گا۔

"میں سمجھی نہیں بھیا"۔

"ہم سب ڈاکٹر مل کر بھی شاید اس کی ٹانگ نہ بچا پائیں گے نیلما۔"

"نہ ......نہ......نہیں بھیا"۔ وہ کانپ اُٹھی جیسے کسی نے اُسے موت کی سزا سنائی ہو۔ "نہیں بھیا۔ ایسا نہ کہو۔ ابھی تو یہ جوان ہے۔ ابھی اِس نے دیکھا ہی کیا ہو گا؟ ابھی تو اِسے جانے کون سی منزلیں طے کرنا ہوں گی۔ ابھی تو...... بھیا ابھی تو اس کے سپنے بھی پورے نہیں ہوئے ہوں گے بلکہ ابھی تو اِس نے سپنے دیکھنا شروع کیے ہوں گے۔ یہ اپنی ٹانگ کھو جائے گا تو پوری عمر کیا کرے گا؟ بھیا جب میں اِسے ملوں گی یا اِسے دیکھوں گی تو

اس کی مجبوری اور بے بسی دیکھ کر میں ہر بار مرتی رہوں گی۔

''ہمت سے کام لو۔'' ڈاکٹر راہول اُسے حوصلہ دیتے ہوئے بولے۔ میں کوشش کروں گا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے فی الحال تم اپنے آپ کو سنبھالو اور پولیس کو سب کچھ بتا دو۔

''پولیس...... ہاں بھیا، مجھے یاد آیا'' وہ کچھ یاد کر کے فوراً بولی۔ ''جب اس حادثے کے بعد میں اِس نوجوان کے پاس پہنچی تھی تو اس نے مجھ سے بھاگ جانے کو کہا تھا۔

''کیوں......؟''

''مجھے نہیں معلوم''۔

ڈاکٹر راہول کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے، مجھے خوشی ہے کہ تم اسے چھوڑ کر نہ بھاگ آئی۔ وہ تمہارا سب سے بڑا جرم ہوتا۔ بہر حال پولیس تم سے جو پوچھے بتا دینا''۔

''تو کیا میں اپنے جُرم کا اقبال کروں؟''۔

''تم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے بلکہ حادثہ ہوا ہے تم سے اس لیے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ڈاکٹر راہول نے خود ہی پولیس کو فون کیا اور پھر اُس زخمی اور بے ہوش نوجوان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انہوں نے پہلے اُسے گلوکوز چڑھایا ہوا تھا اب انہوں نے اُسے خون بھی چڑھا دیا۔ نیلما سب کچھ دیکھتے ہوئے بس آنسوں بہائے جا رہی تھی۔ اُسے دُکھ تھا کہ یہ سب کچھ اُس کی وجہ سے ہوا ہے اور وہ بانکا اور خوبصورت نوجوان اُسی کی وجہ سے اپنی ٹانگ کھو جائے گا اور عمر بھر ٹھوکریں کھاتا رہے گا۔ اُسے سہارا دینے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔ وہ بے ہوش تھا اور نیلما اُسے دیکھتے ہوئے اندر ہی اندر سوچ رہی تھی کہ شاید وہ کسی کا ساجن ہو اور کوئی خوبصورت سجنی اپنی آنکھوں کے اندر اس کے سپنے سجائے اس کی راہ تک رہی ہو لیکن جب اُسے اپنے ساجن کے اِس حال کا پتہ چلے گا تب اُس کے سُندر سپنوں کا کیا ہوگا؟ وہ اپنے ساجن کی یہ حالت دیکھ کر زندہ رہ سکے گی اور اگر وہ کسی طرح زندہ رہ بھی گئی تو کیا وہ کبھی کُھل کر مُسکرا سکے گی۔ نیلما اندر ہی اندر مرتی جا رہی تھی۔ اُس نوجوان کی حالت دیکھ کر وہ گھٹتی جا رہی تھی۔

پولیس کے آتے آتے اُس نوجوان کو بھی ہوش آ گیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ اپنے سامنے کھڑے ڈاکٹر راہول، نیلما اور پولیس آفیسر کو دیکھتا رہا۔ دوائیوں کے اثر سے

اُس کا درد تھوڑا سا دبا ہوا تھا لیکن پوری طرح ختم نہ ہوا تھا۔ پولیس آفیسر نے اُس سے اُس کا نام پوچھا۔

"وشال۔" اُس نے اپنا نام بتا دیا۔

"وہ حادثہ کیسے ہوا تھا؟ میں آپ سے آپ کا بیان لینے آیا ہوں۔

"لاپروائی"۔ وشال نے نیلما کی طرف دیکھا جس کے چہرے میں جیسے اُس کے جسم کا پورا لہو جمع ہو گیا تھا۔ وہ بہت ڈری ہوئی لگ رہی تھی۔ وشال اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر بولا۔ "میرا حادثہ ایک تیز رفتار ٹرک سے ہوا تھا۔" اُس کا نمبر وغیرہ تو دیکھا آپ نے۔؟"

"نہیں۔" اُس نے پھر نیلما کی طرف دیکھا جو اُس کے بیان پر حیران ہوئی جا رہی تھی۔ وہ بولا۔ رات ہو رہی تھی اس لیے میں اندھیرے میں اُس کا نمبر نہ دیکھ سکا تھا۔ یہ حادثہ ہونے کے بعد وہ رُکا بھی نہیں تھا۔ مجھے سڑک پر چھوڑ کر چل دیا تھا۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ شاید اس کی ٹانگ کا درد پھر سے جاگ پڑا تھا۔ "بولا" کچھ دیر بعد ایک جیپ گاڑی وہاں رُکی۔ اُس میں یہ تھیں۔ اُس کا اشارہ نیلما کی طرف تھا۔ "مجھے دیکھ کر انہوں نے وہاں سے جیپ گاڑی روکی تھی۔ بس مجھے اتنا ہی یاد ہے۔ شاید یہی مجھے اُٹھا کر یہاں لے آئی ہوں۔"

"ہاں یہی آپ کو یہاں لے آئی تھیں۔" ڈاکٹر راہول بولے۔

"ان کا بہت بڑا احسان ہے مجھ پر۔

نیلما سے یہ سب سُنا نہ جا رہا تھا۔ اُس نے اپنی زبان کھولنا چاہی تھی کہ ڈاکٹر راہول نے اشارہ کر کے اُسے منع کیا۔ پولیس آفیسر نے وشال سے کئی اور سوال پوچھے اور پھر اپنی ضروری کاروائی کرنے کے بعد وہاں سے نکل گیا۔ تو نیلما نے پھر راہول کی طرف دیکھا۔ وشال نے نیلما کی نشاندہی کرنے کے بدلے ایک جھوٹا بیان دیا تھا۔ اُس نے نیلما پر کوئی آنچ نہ آنے دی تھی۔ نیلما اور ڈاکٹر راہول حیران ہوتے جا رہے تھے۔

"مسٹر وشال"۔ ڈاکٹر راہول نے دھیرے سے اُسے آواز دی تو اُس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ڈاکٹر راہول نے پوچھا۔ "یہ آپ نے کیا بیان دیا۔"

''مجھے یہی اچھا لگا۔''

''لیکن کیوں''۔

''کیونکہ میں اپنی کرنی کی سزا کسی اور کو نہ دلوانا چاہتا تھا۔''

''میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔''

''میں نے یہ حادثہ اپنے ساتھ جان بوجھ کر کروایا تھا۔''

''نہیں'' نیلما تڑپ اُٹھی۔ ڈاکٹر راہول بھی حیران ہو گئے۔

''ہاں...... میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''تو خودکشی کی کوشش کی تھی آپ نے''۔ ڈاکٹر راہول نے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ فوراً بولا۔ میں نے خودکشی کی کوشش نہ کی تھی اور نہ ہی مرنا چاہتا ہوں۔ مجھے خودکشی ہی کرنا ہوتی تو گاڑی کے نیچے ٹانگ نہ دیتا، سر دے دیتا۔

وہ دونوں اُس کی باتیں سمجھ نہ پا رہے تھے۔ بیمار سے بیمار آدمی کو بھی مرنے کی تمنا نہیں ہوتی ہے اور وہ تو ایک خاصا نوجوان تھا۔ وہ مرنا بھی نہیں چاہتا تھا اور اپنے ساتھ اتنا بڑا حادثہ بھی کروا چکا تھا۔ نیلما اور ڈاکٹر راہول نے اس کے بارے میں کچھ اور بھی جان لینے کی کوشش کی لیکن اُس کی ٹانگ میں پھر سے درد جاگ پڑا تھا۔ اس لیے وہ زیادہ نہ بول سکا۔ درد اور بڑا تو راہول نے اُسے انجکشن دی جس کے اثر سے وہ جلد ہی سو گیا۔ لیکن نیلما پوری رات نہ سو سکی اور وہ راہول کے منع کرنے کے باوجود پوری رات ایک کرسی لے کر اُس کے سرہانے بیٹھی رہی۔ اُس نے وشال کے لیے نرس کو بھی منع کر دیا تھا۔ وشال گو کہ اس کے لیے اجنبی تھا لیکن پھر بھی اس کے دل میں وشال کے لیے ہمدردی تھی کیونکہ وشال کی حالت اُسی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ رات میں راہول بھی کئی بار وشال کو دیکھنے آیا اور اس کی جانچ کر کے واپس چلا گیا۔ صُبح جب وشال کی آنکھ کھلی تو نیلما اور راہول دونوں اس کے سامنے کھڑے تھے۔

''گڈ مارننگ مسٹر وشال۔'' راہول نے اُس کا سواگت کیا۔

''گڈ مارننگ ڈاکٹر۔'' بہت ہی کمزور آواز میں اُس نے جواب دیا۔

''اب کیا حال ہے آپ کا؟''

''میں تو ٹھیک ہوں لیکن آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' ڈاکٹر راہول بولے۔ میں آپ کی باتوں پر حیران ہوں۔ خودکشی کا اِرادہ نہ رکھتے ہوئے بھی آپ نے اپنے ساتھ اتنا بڑا حادثہ کروایا۔

ڈاکٹر راہول کی اِس بات پر وہ دیکھتے ہی دیکھتے کہیں کھو گیا جیسے اندر ہی اندر سوچ رہا ہو۔ کہ ایسا کر کے اُس نے ٹھیک کیا یا غلط؟ پھر بولا۔ یہ آپ نہیں سمجھ پائیں گے ڈاکٹر صاحب۔

''لیکن اِس حادثے کے بعد مجھے ڈر ہے کہ ہم......؟

''جو بھی کہنا ہو ڈاکٹر صاحب کُھل کر کہیئے۔ میں ہر بات سُننے کو تیار ہوں۔''

''مجھے ڈر ہے کہ...... دیکھئے یہ ضروری نہیں ہے لیکن پھر بھی مجھے ڈر ہے کہ ہم آپ کی ٹانگ نہ بچا پائیں گے۔

''تھینک یو ڈاکٹر''۔ درد اور غم کے اس ماحول میں بھی وشال کے لبوں پر مُسکراہٹ کی ایک ہلکی سی لکیر پھیل گئی۔ جیسے اُسے کوئی زبردست خوش خبری سُنائی گئی ہو۔ ''تھینک یو۔''

راہول اور نیلما اُسے یہ خبر سُنانے سے پہلے سوچ رہے تھے کہ یہ خبر سُن کر اُسے شاید دل کا ایک سنگین دورہ پڑے گا یا پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے گا یا پھر وہ پاگلوں کی طرح چیخے گا، چلائے گا، اپنے کپڑے پھاڑ دے گا، بال نوچ ڈالے گا اور روتے بلکتے ہوئے ڈاکٹر راہول سے التجا کرے گا کہ وہ کسی طرح اُس کی ٹانگ کو کٹ جانے سے بچالے لیکن وہ حیران تھے کہ اتنی بھیانک خبر سُن کر وشال اِس قدر خوش ہوا ہے۔ حیرت کا پورا ہمالیہ اُن دونوں پر ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہا تھا۔ راہول نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ وشال پھر بولا۔

''جلدی سے اِسے کاٹ پھینکو۔ اگر اسے میرے جسم سے کاٹ پھینکنے کی ضرورت بھی نہ ہو تب بھی اسے کاٹ پھینکو۔ میں پوری زندگی آپ کا احسان مانتا رہوں گا۔

اُس کی باتیں سُن کر ڈاکٹر راہول کو اس کی دماغی حالت درست نہ ہونے کا شک گزرا۔ ایسا ہی شک نیلما کو بھی گزرا۔ نیلما نے اُسے غور سے دیکھا تا کہ اُس کے چہرے سے اُس کے دل کی کسی بات کا پتہ لگا سکے لیکن اُس کے چہرے پر کچھ نہ تھا ہاں آنکھوں میں ضرور سپنے تھے۔ راہول نے کہا۔

''آپ آرام کرو۔ میں آپ کی ٹانگ کو بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔''

''نہیں ڈاکٹر نہیں''۔ وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ اپنی ٹانگ کو کٹوانے کے لیے میں نے اتنی تکلیف اٹھائی ہے۔ آپ اس کو بچائیں گے تو......تو میں تو مارا ہی جاؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب میں مانتا ہوں کہ ہر مریض کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرنا آپ کا فرض ہے لیکن اپنے فرض کو نبھاتے ہوئے آپ کیا میری پوری دُنیا مٹا دیں گے؟۔

نیلما اور ڈاکٹر راہول پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹتے جا رہے تھے۔ وہ دونوں اچھے تعلیم یافتہ تھے۔ دونوں نے دُنیا بھر کی کتابیں پڑھ لی تھیں لیکن اُن ساری کتابوں میں انہوں نے کسی بھی ایسے آدمی کا ذکر نہ پڑھا تھا۔ راہول نے پوچھا۔ اپنے جسم کا ایک پیارا حصہ کٹوانے میں آپ خوش ہیں کیا؟۔''

''ہاں''۔ وہ فوراً بولا۔ ''میں بہت خوش ہوں۔ خوش نہ ہوتا تو اتنا زور کیوں دیتا؟ بے شک آپ نے ایسا آدمی صرف مجھ میں دیکھا ہوگا لیکن مجھے یقین ہے کہ آئندہ آپ کو ایسا کرتے ہوئے بہت سارے نوجوان نظر آئیں گے۔ کوئی اپنی ٹانگ کٹواتا پھرے گا تو کوئی اپنا بازو اور یہ مہان دیش ایک دن اپاہجوں کا دیش کہلوائے گا۔ شرم آئے گی ہمارے پورے سماج کو۔ نہ ہل چلانے والا کوئی ملے گا نہ بندوق اُٹھانے والا کوئی ملے گا۔

اُس کی باتوں کا مطلب نکالنے میں وہ بہر حال ناکام تھے۔ کبھی اُن کو شک گزر رہا تھا۔ کہ اُسکی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے تو کبھی ان کو گمان ہو رہا تھا کہ اسکی باتوں میں کوئی گہرا راز پوشیدہ ہے۔ راہول بولا۔

مسٹر وشال میں ایک Aurtho seurgeon ہوں اور ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے میرا فرض ہے کہ میں آپ کے جسم کے ہر حصے کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں۔ آپ کو اپنے آپ سے اور اپنی ٹانگ سے جو بھی دشمنی ہے اسکی وجہ سے میں اپنے فرض سے منہ نہیں موڑ پاؤں گا۔ میں آپ کے علاج میں کوئی کمی نہ رکھوں گا اور کوشش کروں گا کہ آپ کی ٹانگ بالکل ٹھیک ہو جائے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جن لوگوں کے جسموں سے ان کے حصے کاٹے جاتے ہیں ان کا کیا حال ہو جاتا ہے؟۔ وہ محتاج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اپاہج کہلاتے ہیں وہ اور ان کے زندہ رہنے کا کوئی بھی راستہ نہیں رہتا ہے۔ وہ چلنے لگے لیکن تبھی وشال نے آواز

دے کرانکو روکا۔ بولا۔

مجھے معلوم ہے کہ اپاہجوں کی زندگی کیسے گزرتی ہے، کیسے وہ اوروں پر بوجھ بن جاتے ہیں لیکن آپ نے بھی تصویر کا صرف ایک ہی رخ دیکھا ہے۔ دوسرا رخ دیکھا ہی نہیں ہے اسلئے آپ کو معلوم نہیں ہے کہ اس تصویر کا دوسرا رخ بہت خوبصورت ہے۔ ارے میرے جینے کا راستہ تو اپاہج بن جانے میں ہی ہے۔ آپ کے خیال میں دنیا میں اپاہجوں کی کوئی قیمت نہیں ہے لیکن آپ کو شائد معلوم نہیں ہے کہ اس سماج نے ہم نوجوانوں کو یوں بھی اپاہج بنایا ہوا ہے۔ یہ سماج شائد آپ سے کوئی خراج نہیں لے سکا ہے اسلئے آپ کو اس کڑوی حقیقت میں سچائی نظر نہیں آرہی ہے۔ ابھی آپ جیسے خوش نصیب بھی نہیں ہے اس سماج نے میرے جیسے ہزاروں لاکھوں نوجوانوں سے یہ خراج کسی نے کسی صورت میں ضرور لیا ہے اور لاکھوں نوجوانوں سے کسی نہ کسی صورت میں ضرور مانگ رہا ہے۔ مجھے بھی یہ خراج دینا پڑے گا ڈاکٹر اور میں یہ خراج دے کر ہی اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی حاصل کر سکوں گا۔ اسلئے دیر نہ کرو۔ الگ کردو میرے جسم سے میری ٹانگ ۔ کاٹ پھینکو اسکو مجھے کوئی بھی تکلیف نہ ہوگی، کوئی دُکھ نہ ہوگا، وہ تکیئے میں منہ چھپا کر رونے لگا اور روتے ہوئے بولا۔ لیکن اس کے بعد میں اس سماج کے چہرے پر ایک ایسا طمانچہ ماروں گا جسے یہ سماج کبھی بھلا نہ سکے گا۔

بہت دیر تک وہ روتا رہا۔ نیلما اور راہول دونوں میں سے کسی کو بھی اسے روکنے کی ہمت نہ ہوسکی۔ وشال کی بھرپور جوانی کا یہ حال ان سے دیکھا نہ جارہا تھا۔

نیلما پہلے تو اس بھیانک حادثے سے ڈری ہوئی تھی۔ پھر وہ اس بات سے بھی ڈرگئی کہ وشال کی ٹانگ کاٹی جائے گی۔ یہ دونوں چیزیں صرف اُسی کی وجہ سے ہوگئی تھیں۔ نیلما اس سب کی ذمہ وار تھی۔ وشال نے جو تکلیف سہی تھی، جو تکلیف وہ سہہ رہا تھا اور آنے والے دنوں میں جو تکلیف اُسے اُٹھانا ہوگی نیلما اس سب کے لیے خود کو ذمہ دار ٹھہرا رہی تھی۔ علاوہ وشال کی باتوں سے وہ بہت ڈر رہی تھی۔ اس کی باتیں نیلما کو بہت پُراسرار لگ رہی تھیں۔ اُس نے کئی بار وشال کے چہرے سے اور آنکھوں سے اُس کے دل کا حال جان لینے کی کوشش کی تھی لیکن اُس میں بھی وہ ناکام رہی تھی۔ وشال کی آنکھوں میں بے شمار

آنسوں تھے لیکن وہ آنسوں اس غم کے نہ تھے کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ الگ کیا جا رہا ہے بلکہ وہ آنسوں اس کے کسی پُراسرار دُکھ کے تھے۔ جس کا اُس نے کسی پر اظہار بھی نہ کیا تھا۔ اور نہ ہی اس دُکھ کا کوئی سایہ اُس نے اپنے چہرے پر پھیلنے دیا تھا۔ وہ خاموش تھا اور نیلما اس کی خاموشی توڑنے کی ایک ناکام کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ نیلما کو اس کے ساتھ بہت ہمدردی بھی تھی اور اس ہمدردی کی وجہ سے وہ اس کی تیمارداری میں لگی ہوئی تھی اور اس تیمارداری کے دوران وہ اُس کے ساتھ بہت گھل مل گئی تھی۔

"آپ کیا کرتی ہیں؟" وشال نے اُسے پوچھا۔

"میں سچائی سے پیار کرتی ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں"۔

"میں ایک رائٹر Writer ہوں۔"

"کیا آپ لکھتے وقت سچائی کے ساتھ انصاف کر پاتی ہیں؟"۔

"کوشش تو یہی رہتی ہے۔ آپ کیا کرتے ہیں؟"۔

"میں...... میں سپنے دیکھتا ہوں۔"

"سپنے دیکھتے ہیں؟"۔

"ہاں لیکن کیا سپنے دیکھنے پر کوئی پابندی ہے؟"۔

"نہیں۔ لیکن یہ کوئی پیشہ تو نہیں ہوا۔"

"میرا تو پیشہ یہی ہے۔"

"اچھا کیا سپنوں کو پورا کرنے کے لیے جتن بھی کرتے ہیں؟"۔

"کرتا ہوں نا؟" وہ فوراً بولا، بہت جتن کرتا ہوں یہاں تک کہ خوشی سے اپنی ٹانگ بھی کٹواتا ہوں۔"

"ایسا نہ کہو، وہ تڑپ اُٹھی۔

"ایسا ہی ہے"۔

"پھر کیوں نہ آپ مجھے اپنے سارے سپنے بتا دو۔"

"کیا کرو گی اُن کے بارے میں جان کر۔"

"شاید تمہارے سپنوں کو پورا کرنے میں، میں کوئی مدد کرسکوں۔

وہ ایسے مسکرایا کہ جیسے اپنے آپ پر یا پھر نیلما پر طنز کر رہا ہو۔ پھر لمحہ بھر کے لیے خالی آنکھوں سے کمرے کی چھت کو گھورتا رہا۔ نیلما اسے غور سے دیکھتی رہی۔ اُسی لمحے بھر میں اُس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی پھیل گئی۔ وہ ایک آہ بھر کے بولا۔

"Thanks" نیلما۔ لیکن میرے سپنے کوئی کوہ نور، کوئی تختِ طاؤس یا کوئی تاج محل حاصل کرنے کے نہیں ہیں۔ نہ میں نے چاند ستارے یا سونا چاندی حاصل کرنے کے سپنے دیکھے ہیں کبھی، نہ میں نے دولت حاصل کرنے کی آرزو کی ہے کبھی۔ ہر عام آدمی کی طرح میرے سپنے بالکل معمولی ہیں اور اُن کو میں خود پورا کروں گا۔

"میں خوش ہوں کہ تم میں اب بھی کچھ کر گزرنے کی ہمت ہے۔ بہر حال تم مجھے اپنے سپنے بتا ہی دو۔ تم مجھے اپنی پوری کہانی سنا دو۔ خوشی ہے تو خوشی کی حد سُناؤ۔ غم ہے تو غم کی انتہا سناؤ۔ اپنا ہر سپنا بتاؤ۔ میں تمہارے ہر سپنے کی ہر سچائی کے ساتھ پورا انصاف کرنے کی کوشش کروں گی۔ تمہاری زندگی کی ہر سچائی کو اپنے لفظوں میں ڈال کر میں ایک ایسی کہانی لِکھ دوں گی جس سے شاید پوری دُنیا میں انقلاب آجائے گا۔

"انقلاب......؟۔ وہ آنکھیں بند کر کے بولا۔ نفرت ہے مجھے اِس ناپاک اور نامراد لفظ سے۔

"ناپاک اور نامُراد......؟"۔

"ہاں...... انقلاب کو آنا ہوتا تو گیتا اور قرآن سے آجاتا، گرو گرنتھ صاحب اور بائیبل سے آجاتا۔ کیا نہیں لکھا ہے اِن کتابوں میں اور کس نے نہیں پڑھی ہیں یہ کتابیں؟۔ تم نہیں جانتی ہو نیلما کہ انقلاب کی اُمید پر آج تک کتنی جانیں گئی ہیں؟ اس لفظ نے تو ہر دل میں کہ یہ جھوٹی اُمید بٹھا دی ہے کہ انقلاب آئے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا لیکن انقلاب کا صرف نام رہ جاتا ہے وہ نہیں آجاتا ہے اور نہ ہی اُس کے نعرے لگانے والے اپنا مطلب نکالنے کے بعد دوبارہ اس لفظ کو دُہراتے ہیں۔ تم نہیں جانتی ہو کہ میں نے کتنے دن، کتنی راتیں اس کے انتظار میں کاٹی ہیں لیکن کچھ ہاتھ نہ لگا ہے میرے۔ اِسی انقلاب کے لیے شِودت نے اپنی جان دی۔"

"شودت کون؟"۔

''میرا ایک واقف۔ تم اُسے کہاں جانتی ہو؟ جانتی تو انقلاب کی بات نہ کرتی۔

''تم مجھے اُس کے بارے میں بھی بتاؤ۔''

''میں تمہیں کبھی اُس کی بیوہ سے ملاوں گا۔''

''مجھے اس کا پتہ دو۔ میں اُسے مِل آوں گی۔''

''مِلنا ہے اُسے تو......؟ نیلما۔ تم نہ ڈھونڈ پاؤ گی اُسے۔ جانے کِس بازار میں......؟ اپنے بچوں کی پرورش تو بہر حال اُسے کرنا ہی ہوگی۔ جسم کا کیا ہے۔ بِکے یا لُٹے۔

''اوہ......؟''

''ہاں......وہ انقلاب کی اُمید کا شکار ہے۔ اِسی اُمید کا میں بھی شکار ہوں اور جانے کتنے لوگ اُس اُمید کا شکار ہوں۔ اس لیے بھول جاؤ کہ انقلاب آئے گا۔

''تم تو ہمت ہی ہار گئے ہو۔''

''ہمت ہی ہاری ہوتی تو مجھے غم نہ ہوتا۔ بہت کچھ ہار چکا ہوں۔ میں نیلما اور بہت کچھ ہار بھی رہا ہوں۔

اس طرح ہمت نہ ہارو وشال۔ اگر تم کچھ ہار گئے ہو تو اُسے بھول جاؤ لیکن جو چیز تم اب ہارنے جا رہے ہو اُسے بچانے کی کوشش کرو۔ سب تمہارے ساتھ ہوں گے۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ یہ انقلاب اگر آج تک کوئی نہ لے آیا ہے تو میں اُسے لے آوں گی۔ کسی بھی صورت میں لے آوں گی۔

''ہاں میں لے آوں گی انقلاب۔ وہ پورے یقین کے ساتھ بولی اور تم بھی مجھے کمزور نہ جانو۔ مجھ پر یقین کرو۔ میرے ہاتھ میں بندوق نہیں ہے، تلوار نہیں ہے تو کیا ہوا، میرے ہاتھ میں قلم تو ہے اور یقین کرو کہ میرے قلم میں بندوق سے بھی زیادہ طاقت ہے۔ میں قلم چلا کر انقلاب لاؤں گی چاہئے اس انقلاب کے لیے، لکھتے ہوئے میری ان انگلیوں اور ناخنوں کے آخری حصّے بھی کیوں نہ گھس جائیں اور چاہئے الفاظ کی تلاش میں مجھے مُنشی پریم چند کی راکھ بھی کیوں نہ تلاشنی پڑے۔ بس تم شروع سے آخر تک تم مجھے اپنی کہانی سُناؤ۔ اپنا ہر حادثہ، ہر تجربہ سناؤ، ہر خوشی، ہر غم سناؤ۔ سناؤ کہ کس لمحے کس نے تمہاری خوشیاں لوٹ لیں، سناؤ کہ کس پَل کس نے تمہیں غم دیئے، سناؤ کہ کس کو تم نے اور کس نے تم کو دل دیا۔ سب کچھ

مجھے بتاؤ۔ سناؤ کہ یہ سوغات غم کس نے دی تمہیں؟ وہ اس کی ٹانگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ سناؤ کہ تمہارے سپنے کیا ہیں، تمہاری منزل کیا ہے، تمہارا ہمسفر کون ہے؟۔ کہانی تمہاری ہوگی الفاظ میرے ہوں گے، اگر واقعی تم نے اپنے کسی سپنے کو پورا کرنے کے لیے اتنی تکلیف سہی ہے تو یقین جانو کہ تمہاری کہانی لوگ جانیں گے تو انقلاب ضرور آجائے گا کیونکہ ہر سپنے کا کسی نہ کسی انقلاب کے ساتھ ضرور تعلق ہوتا ہے۔

''تم شاید ٹھیک کہتی ہو نیلما۔ وہ اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے بولا۔ لیکن ابھی تم مجھ سے میری کہانی نہ پوچھ لو۔ ابھی میں تم کو کچھ نہ بتا پاؤں گا کیونکہ ابھی میرا سپنا پورا نہیں ہوا ہے۔ ابھی۔ ابھی میری ٹانگ بھی تو نہ کٹی ہے۔

''ایسا نہ کہو''۔ وہ تڑپ کر بولی۔ میں نے کتنی بار دعا کی ہے کہ تمہاری ٹانگ کا ہر زخم ٹھیک ہو جائے اور بھیا بھی اس کے لیے کتنی کوشش کر رہے ہیں۔

''ایسی دُعا نہ کرو نیلما ایسی دعا نہ کرو۔ وہ بڑی عاجزی سے بولا۔ اگر کہیں تمہاری دعا اثر لے آئی تو میرا ہر سپنا ٹوٹ جائے گا۔ نیلما، میں کب سے ٹوٹے ہوئے سپنوں کو جوڑتے جوڑتے تھک گیا ہوں۔ اب میرا کوئی سپنا ٹوٹ گیا تو میں شاید اسے جوڑ نہ پاؤں گا۔ تمہاری دعا تمہاری نظر میں دعا سہی لیکن میرے لیے بددعا ہے اور ڈاکٹر راہول کی کوشش میرے سپنوں کو قتل عام کے برابر ہے۔ کیونکہ میری ٹانگ نہ کٹ گئی تو نہ میرے سپنے پورے ہوں گے اور نہ ہی انقلاب آئے گا۔ اُس کی آنکھوں سے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے بھرے ہوئے پیمانے چھلکنے کو بے قرار ہوں۔ نیلما کچھ نہ سمجھ سکی اور نہ ہی اس کے دل کا کرب کم ہو سکا۔ وشال اپنی خوشی سے ناکارہ بن جانا چاہتا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ٹانگ کی سلامتی کے لیے کوئی دعا کی جائے یا کوشش کی جائے اور شاید اسی لیے نیلما کی ہر دُعا بھی بے اثر ثابت ہوئی اور ڈاکٹر راہول کی ہر کوشش بھی ناکام ہوگئی۔ حالانکہ اس نے شہر کے اور بھی ماہر ڈاکٹروں سے بھی اس بارے میں رائے لی تھی لیکن وشال کو اپاہج بن جانے سے بچانے کی کوئی بھی صورت نظر نہ آئی۔ وہ بہت مایوس ہو گیا۔ یہی بات جب اس نے نیلما سے کہی تو وہ پھوٹ کر رو پڑی۔ اپنے آنسوں لے کر وہ بولی۔

''بھیا، اگر کسی دوسرے اہسپتال میں، کسی دوسرے شہر میں یا پھر کسی دوسرے ملک

میں وہ ٹھیک ہو سکتا ہے تو بتا دو۔''

''اگر ایسا ممکن ہوتا نیلما تو میں ہرگز دیر نہ کرتا۔ اب تم جان لو کہ اس کے آپریشن کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم اُسے اس آپریشن کے لیے ذہنی طور تیار کرو۔

''وہ تو شروع سے ہی اس کے لیے تیار ہے بھیا۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ وہ بہت بے تاب ہے اس کے لیے اور یہ خبر سن کر اُسے بہت خوشی ہوگی لیکن میں خود کو کبھی معاف نہ کر پاؤں گی بھیا۔ میں ہر دم، ہر پل مرتی رہوں گی اور وہ بھی عمر بھر کیا کرتا پھرے گا۔ بس ٹھوکریں کھا کھا کر گرتا ہی رہے گا۔ اُسے اُٹھانے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ اُس کا لہولہان جسم ہوگا اور بس۔ وہ اپنے آنسوں خشک کرتے ہوئے بولی۔ ''ابھی...... ابھی کچھ دن پہلے تک وہ ایک پورا انسان تھا۔ کوئی بھی کمی نہ تھی اس میں نہ گرنے کا ہی خطرہ تھا اور نہ ہی سہارا دینے کی ضرورت تھی لیکن مجھے کیا ہوا کہ میں نے اس کی ہنستی کھیلتی زندگی کو یہ سوغات دی......؟ وہ پھر رو پڑی۔

''Relax'' نیلما۔ اب تمہارے اس طرح رونے سے کیا ہوگا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو بھیا لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔

''کیا کرنا چاہتی ہو تم؟۔''

''میں جو کچھ بھی کرنے جا رہی ہوں بھیا اُس پر تم شاید یقین نہ کر سکو لیکن میں اس کے لیے بالکل تیار ہوں اور میرے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔

''کیا ضروری ہے؟''۔ ''ڈاکٹر راہول بولا'' اس کی ٹانگ کاٹی جائے گی تو بے چارہ ناکارہ ہو جائے گا۔ ہم اُسے یہاں کوئی نوکری دیں گے۔ اُسے اور بھی اچھا معاوضہ دیں گے تاکہ وہ پیسے سے محتاج نہ رہے۔ اس کے سوا کر سکتے ہیں ہم؟۔

''ہماری پوری دولت بھی اُس کا نقصان پورا نہ کر سکے بھیا۔ میں اُسے نہیں جانتی ہوں۔ تم بھی اُسے نہیں جانتے ہو۔ ہمارے پاس اُس کا کوئی اتہ پتہ بھی نہیں ہے۔ ہم اس کے ماضی کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے ہیں۔ وہ کون ہے، کہاں کا ہے۔ وہ کسی بھی سوال کا جواب دینے کو تیار نہیں ہے لیکن بھیا وہ جو بھی ہے، جہاں کا بھی ہے، ہے تو ایک انسان جو صرف میری وجہ سے بے بسی کے اس موڑ پر کھڑا ہوا ہے، میری وجہ سے ایک

پورے انسان سے اُدھورا اور ناکارہ بننے جا رہا ہے۔ اس لیے بھیا تم مجھے اس بات کی اجازت دو کہ میں اس کے ساتھ شادی کرلوں۔"

"نیلما۔" ڈاکٹر راہول کے منہ سے بے تحاشا نیلما کا نام نکل گیا۔

"ہاں بھیا"۔ وہ فوراً بولی۔ یہی میں چاہتی ہوں کیونکہ میں اس کی خطاوار ہوں۔ میرے ہاتھوں یہ حادثہ نہ ہوتا تو وہ بھی میری طرح ایک پورا انسان ہوتا لیکن اُس حادثے کی وجہ سے وہ ادھورا ہو رہا ہے اور ادھورا تو نامکمل ہے۔ تمہارے اہسپتال میں مرتے ہوئے کسی مریض کی طرح یا پھر میری کسی کتاب کے کسی بگڑے ہوئے کردار کی طرح اور بھیا نامکمل جو بھی ہوتا ہے اسے مکمل بنانا پڑتا ہے۔ ذرا سوچ لو بھیا کہ دنیا میں میرے بغیر کون سی لڑکی یہ کام کرنے کو تیار ہو سکتی ہے؟۔ بھیا۔ مجھے یہ کرنے دو۔ یہی انصاف ہے بھیا۔ یہی انسانیت بھی ہے۔ مجھے انصاف اور انسانیت اپنانے دو بھیا۔ اس اجنبی نوجوان کی بے چارگی میں اس کے ساتھ مجھے غریبی بھی اُٹھانا پڑے تو میں خوشی سے اُٹھاؤں گی۔ یہی شاید قدرت کی بھی مرضی ہے۔

"نیلما" راہول اس کے قریب آ کر اس کے آنسوں پونچھتے ہوئے بولا۔ تم مہان ہو "You are Great"۔

"تو...... کیا تم نے مجھے اس کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دی؟"۔

"میری طرف سے تمہیں پوری اجازت ہے۔"

"بھیا۔" وہ ڈاکٹر راہول کی بانہوں میں چھپ کر بولی۔ "سب سے گریٹ تو تم ہو بھیا۔ دُنیا کا کوئی بھی آدمی اتنی آسانی سے اتنا بڑا فیصلہ نہیں لے سکتا ہے۔ تم شاید اپنی بہن سے بہت پیار کرتے ہو۔ اس لے تم اس کی کسی بھی بات کو انکار نہیں کر سکتے ہو۔

"پیار کی حد تو تم نہ پوچھو نیلما۔ تم تو میری پوری دُنیا ہو۔ تمہارے بغیر دنیا میں میرا ہے ہی کون؟۔ وہ بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ لیکن تمہارے انصاف اور تمہاری انسانیت کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ تم پر اور تمہارے اس فیصلے پر مجھے ناز ہے نیلما۔ اس لیے تم اپنے فیصلے پر عمل کرنے کے لیے پوری طرح آزاد ہو۔ جاؤ اُسے اس آپریشن کے لیے پوری طرح تیار کرو لیکن ابھی اُسے اپنے فیصلے کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔"

وہ وشال کے پاس گئی اور پھر بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہی لیکن وہ اُسے کچھ نہ بتا سکی۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیسے بتا دے؟۔ وشال اس کی مشکل بھانپ چکا تھا۔ بولا۔

''تم مجھ سے ایسا کیا کہنا چاہتی ہو کہ کہنے سے ڈر رہی ہو۔''

اُس نے چونک کر وشال کی طرف دیکھا تو وہ پھر بولا۔ تمہاری آنکھوں میں کوئی خوف ہے، بتاؤ کیا بات ہے۔

''وہ......بھیا تمہارے آپریشن کے لیے کہہ رہے تھے۔''

وہ آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا۔ تاثر اس کے چہرے پر صرف ایک نہ تھا کہ نیلما سمجھ پاتی کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ وہ کبھی شعلہ تھا تو کبھی شبنم۔ کبھی تبسّم تھا تو کبھی ماتم کدہ۔ نیلما اپنے ذہن کو کھرچتی رہی لیکن پھر وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ تبھی وہ پھر اپنی آنکھیں کھول کر بولا۔

''تم جو سوچ رہی ہو نیلما وہ میں بھی سمجھتا ہوں اور تم یہ بھی نہ سوچو کہ مجھے میری ٹانگ کھو جانے کا دُکھ نہیں ہے لیکن نیلما مجھے بہت خوشی بھی ہے۔ میری اس ٹانگ کی جگہ بے جان بیساکھی لے گی۔ تب میں بے شک تمہارے ساتھ دوڑ نہ سکوں گا لیکن میری منزل کی طرف جانے والے راستوں پر قدموں کے جو نشان ہوں گے اُن کا تعاقب تو کر سکوں گا میں......بے شک بے جان بیساکھی کے سہارے ہی سہی۔

نیلما اُس کا حوصلہ بڑھاتی رہی گو کہ اُس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے وہ خود اندر ہی اندر ٹوٹ رہی تھی۔ لیکن اپنے اندر کے دکھ کو وہ کسی بھی صورت میں وشال پر ظاہر نہ ہونے دینا چاہتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اس کی آنکھوں کے آنسوں دیکھ کر کہیں وشال کی ہمت نہ ٹوٹ جائے۔ جس دن وشال کا آپریشن تھا اس دن وہ جتن کر کے بھی آنسوں نہ روک سکی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوں دیکھ کر وشال نے پوچھا۔

''تم کیوں رو رہی ہوں؟۔''

''تم......تم جانتے ہوں کہ آج کیا ہونے والا ہے؟۔''

''ہاں۔'' وہ بڑی معصومیت سے بولا۔ آج میری ٹانگ کاٹی جانے والی ہے۔''

''تمہیں ذرا بھی دُکھ نہیں ہے؟۔''

''نہیں تو......''۔

''تم جانے کسی مٹی کے بنے ہو؟''

''انسانوں کو بنانے کے لیے چاہئے سانچے الگ الگ بھی کیوں نہ ہوں لیکن مٹی تو ایک ہی ہے نیلما۔ میں بھی اسی مٹی کا بنا ہوں جس کے سب لوگ بنے ہیں۔ لیکن میں دنیا کی دھوپ میں ذرا زیادہ تپ گیا ہوں اور بد نصیبی دیکھو کہ دنیا کی دھوپ میں تپ جانے کے بعد میں کوئی مرمر نہ بنا، کوئی ہیرا نہ بنا جو کسی اچھی جگہ لگایا جاتا، میں ایک معمولی سا پتھر بن گیا۔ ہاں اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ وقت کے پھاوڑے کی ضربوں سے مجھے زیادہ چوٹ نہیں لگتی ہے۔ نیلما، پتھر کو چاہئے جتنا بھی توڑو پتھر ہی رہ جاتا ہے نا چاہئے ٹوٹ کر اس کے کتنے بھی ٹکڑے بھی کیوں نہ ہوں؟ تم اپنے آنسوں روک لو کیونکہ ایک پتھر کے لیے آنسوں نہیں بہائے جاتے ہیں۔''

''تم پتھر نہیں ایک انسان ہو'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''ہاں یہ بھی سچ ہے۔ نیلما اس آپریشن کے دوران میں مر گیا تو میری تصویر اخبار میں چھپا لینا، ساتھ میں اپنا پتہ بھی دے دینا۔ کوئی بال نوچتا، روتا بلکتا اپنی آنکھوں میں آنسوں لیے میری لاش کے درشن کو آجائے گا۔

''ایسا نہ کہو'' وہ روتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔''

''مجھے اس بات کا یقین ہے۔'' وہ فوراً بولا۔ مجھے یقین ہے کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا کیونکہ مجھے نہیں مرنا ہے۔ ابھی تو مجھے اپنے سپنے پورے کرنے ہیں۔''

نیلما سے کسی بھی صورت میں خود کو سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔ جتنی دیر وشال کا آپریشن ہوتا رہا اتنی دیر تک وہ اپنی آنکھوں کے راستے بہتی رہی۔ جب آپریشن کے بعد وشال کو باہر لایا گیا تب وہ اس کے سامنے نہیں جا سکی لیکن پھر ڈاکٹر راہول کے کہنے پر وہ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو سنبھال کر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ جب وشال کو ہوش آئے گا تب وہ پھوٹ کر روئے گا۔ اتنا روئے گا کہ وہ کسی بھی طرح اُسے سنبھال نہ پائے گی لیکن جب اسے ہوش آیا تو وہ ڈاکٹر راہول کی طرف دیکھ کر ایک ہلکی سی مُسکراہٹ مُسکرایا۔ بولا۔

''Thank you'' ''ڈاکٹر۔''

''I am Sorry'' ۔ڈاکٹر راہول نے کہا۔اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔

''افسوس کی اس میں کوئی بات نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔ وہ بہت کمزور آواز میں بولا۔''

میں تو آپ کا احسان مانتا ہوں کہ آپ نے وہی کیا جو میں نے چاہا تھا۔میری ہر تمنا، ہر آرزو پوری کر لی آپ نے۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گا تو بڑی شان سے اُن سے اپنا حق مانگ لوں گا۔

''کن سے''۔

''یہ آپ سمجھ نہیں پائیں گے ڈاکٹر۔'' وقت آنے پر میں آپ کو بتا دوں گا لیکن یہ طے ہے کہ میں آپ کے احسانوں کا بدلہ نہ چکا پاؤں گا۔

''احسان کس بات کا؟''۔

''اس بات کا کہ آپ نے میر من کی مراد پوری کر لی۔آپ ڈاکٹر نہ ہوئے میرے لیے بھگوان ہوئے اور آپ کا یہ اہسپتال میرے لیے بھگوان کا مندر ہو گیا جہاں میں اپنے من سے اپنے سر کو جھکاوں، پوجا کروں، وہ بھرآئی آواز میں بولا۔لیکن ڈاکٹر صاحب کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ آپ مجھے کسی سرکاری یا خیراتی اہسپتال میں بھرتی کرائیں؟۔

''مسٹر وشال''۔وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔آئندہ یہ بات آپ نے کی تو مجھے بہت دُکھ ہوگا۔ابھی آپ آرام کرو۔آپ ٹھیک ہو جاؤ گے تو آپ کے ساتھ جی بھر کے باتیں کریں گے۔ڈاکٹر راہول چلدیئے۔تو وہ نیلما سے بولا۔

''تم ہی ڈاکٹر راہول کو سمجھاؤ نا۔''

''تم نے سنا نہیں کہ وہ کیا کہہ رہے تھے؟''۔

''ہاں لیکن کب تک میں تم لوگوں پر بوجھ بنتا رہوں گا۔

''تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو میں تمہیں خود گھر چھوڑ آؤں گی۔''

''گھر......؟ گھر کا نام سن کر اس کی آنکھوں میں آنسوں بھر آئے جو سامنے کھڑی نیلما نے بھی دیکھے لیکن اس نازک مرحلے پر وہ کچھ اور کہہ کر اُسے ٹھیس نہ پہنچانا چاہتی تھی اس لیے بولی۔

''ہاں۔'' تم فی الحال آرام سے سو جاؤ۔''

اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن نینداس سے کوسوں دور تھی۔ بند آنکھوں کے اندر پلکوں کے پردوں پر جانے کون سی تصویریں اُبھر رہی تھیں۔ جانے اُن تصویروں کے ساتھ وہ اندر ہی اندر کون سی باتیں کر رہا تھا۔ اس کا اندازہ اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں سے نیلما دیر تک لگانے کی کوشش کرتی رہی جس میں وہ بہرحال ناکام تھی۔ وشال کو دیکھ کر نیلما کو صرف یہ لگ رہا تھا کہ وہ ایک بہت ہی گہرے سمندر کی طرح ہے جس میں چھپے ہوئے نایاب موتیوں کو دیکھنے اور چھونے کے لیے اسے اس سمندر میں ڈوب جانا ہوگا اور وہ سیپ نکالنے ہوں گے جن میں وشال کی زندگی کے موتی چھپے ہیں۔

نیلما کے ذہن میں کھلبلی سے مچی ہوئی تھی جیسے اچانک ہی پُرسکون سمندر میں کوئی بھیانک طوفان آیا ہو اور موجیں آسمان کو چھونے کے لیے بے چین ہوں۔ اُس حادثے والی شام سے اُس نے ایک لفظ بھی نہ لکھا تھا۔ ذہن میں بسی کھلبلی نے جیسے اس کے ذہن کو مفلوج کر کے رکھ چھوڑا تھا لیکن اب اس کے ہاتھوں کی اُنگلیاں قلم اُٹھا کر وشال کی کہانی لکھنے کے لیے بے قرار ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ ایک ایسی داستان لکھنا چاہتی تھی جو انسانی تاریخ میں کسی نے نہ لکھی ہو اور کسی نے نہ سُنی ہو اور نہ ہی کسی نے اُس جیسی داستان کا گمان کیا ہو۔ وہ داستان جس میں کسی نے اپنے کسی سپنے کو پورا کرنے کے لیے اپنے جسم کے کسی حصے کو کٹوانے کی قربانی دی ہو۔ نیلما کو وشال کے اس سپنے کا پتہ نہ تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وشال کا وہ سپنا بہت ہی خوبصورت ہوگا ورنہ کیسے وہ اس سپنے کو پورا کرنے کے لیے اتنی بڑی قربانی دیتا؟۔ ابھی وشال بھی اُس حالت میں نہ تھا کہ اُس سے اُس کی کہانی پوچھی جا سکتی؟۔ ابھی وہ بہت کمزور تھا اور ابھی اس کی دیکھ بال کرنے کی ضرورت تھی۔ چند ایک دنوں میں وہ سنبھلنے لگا تو اس نے نیلما سے پوچھا۔

''آج کیا تاریخ ہے۔''

''گیارہ اکتوبر۔''

''گیارہ اکتوبر......؟'' وہ اندر ہی اندر جیسے کچھ یاد کرنے لگا یا پھر کسی چیز کا حساب کرنے لگا۔ نیلما اسے دیکھتی رہی جیسے اس کے اندر کی بات کو جاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ بولا۔ میرا گھاؤ بھر جانے میں کتنی دیر لگے گی؟۔

"مجھے تمہارے گھاؤ کی گہرائی معلوم نہیں ہے۔"

"ڈاکٹر راہول سے پوچھنا پڑے گا۔"

"تمہاری ٹانگ کا آپریشن کرتے ہوئے شاید انہوں نے بھی تمہارے دل کے گھاؤ کی گہرائی نہیں ناپی ہوگی۔

اُس نے چونک نیلما کی طرف دیکھا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ یہ اُن کے لیے ضروری بھی نہ تھا اور میں بھی دل کے زخموں کی بات نہیں کرر ہاہوں، اپنی ٹانگ کی بات کرر ہاہوں۔

"اس میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔"

اس نے اپنے داہنے ہاتھ پر کھلی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ نیلا آسمان بہت پیارا لگ رہا تھا۔ نیلما کے چہرے کی طرح بے داغ یا پھر اس کے دل کی طرح صاف۔ وہ نیلے آسمان کی وسعتوں میں جیسے کھو کر رہ گیا۔ دور ایک اکیلا پنچھی ہوا کے دوش پر لہرا رہا تھا اُسے لگا کہ اس میں اور اس پنچھی میں فرق ہے تو بس اتنا ہے کہ وہ پنچھی اپنے پنکھ پھیلا کر اُڑ سکتا ہے اور وہ اپاہج بنا چل بھی نہ سکتا ہے ورنہ وہ دونوں یکساں ہیں کیونکہ وہ دونوں اکیلے ہیں۔ دونوں کو شاید کوئی تلاش ہے، کھوج ہے۔

"کیا سوچنے لگے؟"۔ نیلما نے پوچھا۔

"کیا تم......؟"۔ "اس کیا آواز اور اس کی آنکھیں یکا یک بھر گئیں تھی۔ بولا۔ نیلما کیا تم میرا گھاؤ بھر جانے تک مجھے رکھ سکتی ہو؟"۔

"یہ کیسا سوال کیا تم نے؟"۔ "نیلما فوراً بولی۔ مجھے تمہارے دل کے زخموں کا پتہ نہیں ہے لیکن تمہارے جسم کے گھاؤ تو بھر ہی جائیں گے اور ان کے بھرتے تم چلے بھی جاؤ گے کیونکہ تمہیں کوئی نامعلوم سپنا پورا کرنا ہے لیکن میرا یہ گھاؤ کہ تم میری وجہ سے اپنی ایک ٹانگ کھو بیٹھے ہو، زندگی بھر نہ بھر پائے گا۔

"تم اپنے دل سے یہ خیال نکال دو نیلما کہ وہ حادثہ تمہاری وجہ سے ہوا تھا۔ وہ حادثہ میں نے خود کرایا تھا۔ تم یہ بھی نہ سوچو کہ میں تمہاری وجہ سے کچھ کھو گیا ہوں بلکہ یہ سوچو کہ تمہاری وجہ سے میں کیا کیا پانے کی امید کرر ہاہوں۔

"تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔"

’’جانے کیسے میری باتیں تمہیں سمجھ سے باہر لگتی ہیں۔ بہر حال تم نے میرے سوال کا جواب نہ دیا۔

’’وہ کوئی سوال نہیں ہے۔‘‘

’’میرے لیے بہت بڑا سوال ہے۔‘‘

’’تو اس کا جواب ہے کہ تم عمر بھر میرے ساتھ، میرے پاس رہو۔‘‘

’’اتنا وقت نہیں ہے میرے پاس، مجھے کہیں جانا ہے۔‘‘

’’مجھے بولو۔ کہاں جانا ہے تمہیں۔ میں لے کر چلتی ہوں۔‘‘

’’تھینک یو۔‘‘ وہ پھر جانے کہاں کھو گیا۔ دراصل جب سے وہ نیلما کے ہاں آیا تب سے وہ تقریباً ہر وقت کھویا کھویا ہی رہا تھا اور کبھی کبھی تو باتیں کرتے کرتے ہی وہ کھوتا رہا تھا۔ وہ کہاں اور کس میں دیکھتے ہی دیکھتے کھو جاتا ہے۔ یہ نیلما کی سمجھ سے باہر تھا۔ دراصل وہ شروع سے ہی اس کے سامنے ایک حل طلب سوال کی طرح تھا جس کا جواب نیلما آج تک نہ نکال سکی تھی۔ اس کے ذہن میں بس یہی بات تھی کہ وشال کے ساتھ جو ناانصافی اور زیادتی ہوئی ہے اس کی ذمہ دار وہ ہے اس لیے وہ ہر طرح سے وشال کی مدد کرنا چاہتی تھی لیکن وشال کو کسی خاص چیز کی ضرورت ہی نہ تھی اور نہ ہی اس نے کبھی اپنی کسی خواہش کا اظہار کیا تھا حالانکہ نیلما اس کی ہر خواہش کا پتہ لگانا چاہتی تھی، اس کی ہر خواہش کو پورا کرنا چاہتی تھی وہ وشال کی کوئی بھی خواہش پورا کرنے کے لیے ہمہ تن تیار تھی۔ ایک دن وشال بولا۔

’’نیلما تمہارے اوپر ایک اور بوجھ ڈالنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’میں تمہارا ہر بوجھ ڈھونے کو تیار ہوں لیکن پہلے بتاؤ کہ اس سے پہلے تم نے میرے اوپر کیا بوجھ ڈالا ہے؟۔

’’اپنے ناکارہ وجود کا۔‘‘

’’وشال۔‘‘ وہ بڑی سنجیدگی سے بولی۔ تم اپنی سوچ بدل دو۔ مجھے بہت خوشی ہوگی۔

’’سچائی کو کیسے بدل دوں۔؟‘‘

’’پھر سچائی جاننے کی کوشش کرو۔ وہ تیزی سے بولی۔ جس سے وہ حادثہ ہوا میں دن میں سو سو بار مرتی رہتی ہوں کہ میری وجہ سے......؟ اور تم اپنے آپ کو میرے اوپر بوجھ مانتے

ہو؟۔ بہت بڑے ہو تم۔ بہت عظیم ہو لیکن اب اس سے زیادہ بڑا بن جانے کی کوشش نہ کرو۔ تمہارے سامنے میں خود کو پہلے ہی بہت چھوٹی محسوس کرتی ہوں۔ تم....... تم کچھ بھی نہیں سمجھتے ہو، یا سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہو یا پھر سب کچھ سمجھ کرنا سمجھی جتا رہے ہو۔ میں پاپی ہوں، تمہاری خطاوار ہوں، ہر سزا اُٹھانے کو تیار ہوں۔ وہ آنکھوں کے بھیگے کونوں کو صاف کرتے ہوئے بولی اور تم خود کو میرے اوپر ایک بوجھ مانتے ہو:

''I am sorry'' وہ شرمندگی سے بولا۔ ''میرا یہ مطلب نہ تھا۔''

''آئندہ ایسی کوئی بات کبھی نہ کرنا۔''

''نہ...... نہ کروں گا۔ توبہ کرتا ہوں''

''اب تم اپنی ضرورت بتاؤ۔'' وہ آنسوں خشک کر کے بولی۔ ''کیا کہنا چاہتے تھے تم؟''

''مجھے کچھ کتابیں چاہیے ہوں گی۔''

''کون سی؟''

''جنرل نالیج کی۔''

''کیا کرو گے تم اُن کا؟۔''

''میں ایک امتحان میں بیٹھ رہا ہوں۔''

''بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ تم نے ہمت نہ ہاری ہے۔''

''ہمت ہار کر میں مرنا نہیں چاہتا ہوں۔''

''میں بھی چاہتی ہوں کہ تم زندہ رہو۔''

''تم جیسے دوستوں کا ہی سہارا ہے مجھے بھی۔''

اگلے ہی دن نیلما نے اُسے اس کی ضرورت کی ڈھیر ساری کتابیں لا کر دیں بولی۔'' یہ جنرل نالیج کی تازہ ترین کتابیں ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان سب کو پڑھ کر تم تمہارے امتحان میں ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ پھر نہ جانے کہاں کھو گیا؟۔ نیلما اس کے چہرے کو غور سے دیکھتی رہی۔ ہر بار کی طرح آج بھی وہ اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتی رہی لیکن ہر بار کی طرح وہ آج بھی کچھ نہ جان سکی۔ درد و کرب، رنج و غم اس کے چہرے پر ضرور تھا۔ لیکن وہ

دردوکرب اور وہ رنج وغم کس بات کا ہے، اس کی حد کیا ہے۔ نیلما کچھ بھی نہ جان سکی۔ بولی۔

''اب کہاں کھو گئے۔''

''کچھ نہیں۔'' وہ سنبھل کے بولا۔ میں ذرا اپنے آنے والے دنوں کی تصویریں دیکھنے لگا تھا۔

''تمہارے آنے والے دنوں کے بارے میں شاید میں جان ہی جاؤں گی لیکن تم نے آج تک مجھے تمہارے گزرے ہوئے دنوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے۔

''اُن میں ذلتِ اور شکست کے سوا کیا ہے اور پھر اُن کے بارے میں جان کر تم کیا کرو گی؟۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں تمہارے سپنوں کو لے کر ایک ایسا ناول لکھوں گی کہ جس سے انقلاب آجائے گا۔ اس لیے کہدو کہ کون ہو تم اور کیا ہیں تمہارے سپنے؟۔

''کون ہوں میں......؟ وہ کچھ سوچنے لگا جیسے اپنے آپ سے اپنی پہچان پوچھ رہا ہو۔ پھر بولا ''نیلما'' میں کون ہوں اور میرے سپنے کیا ہیں یہ تم مجھ سے کچھ دن بعد پوچھو۔

''کتنے ہی دنوں سے تم مجھے ٹال رہے ہو؟۔''

''اس بات کا تم بُرا نہ مانو نیلما کیونکہ تمہیں اپنا سپنا بتا کر میں اپنا سپنا پورا نہ کر سکا تو میں تم سے کبھی نظریں نہ ملا پاؤں گا لیکن میرا سپنا پورا ہوا تو میں تمہیں بڑی شان سے سب کچھ بتا دوں گا۔ تم میری کہانی کو اپنے الفاظ میں ڈال کر جس کو چاہو سُنا دینا۔''

نیلما کچھ نہ بولی، اُس نے من ہی من میں فیصلہ کیا کہ وہ فی الحال وشال کو اس کی کہانی سُنانے کے لیے مجبور نہ کرے گی بلکہ اسے اس کا امتحان پاس کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ محنت کرنے کے لیے اُکسائے گی۔ اس نے وشال کو بے شُمار کتابیں لا دیں اور وہ اُن کتابوں میں کھو کر رہ گیا۔ امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے وہ اُن کتابوں میں لکھی ہر بات کو اپنے ذہن میں جذب کرتا رہا اُس کی محنت اور لگن دیکھ کر نیلما کو یقین ہو گیا تھا کہ وشال نہ صرف امتحان میں کامیاب ہو جائے گا بلکہ اول بھی آئے گا۔ نیلما نے جا کر اس کے امتحان کا پتہ بھی کر دیا تھا، اُسے امتحان کا پتہ وغیرہ دے کر وہ بولی۔

''تم نے بہت محنت کی ہے اس لیے مجھے یقین ہو جائے گا کہ تم ضرور کامیاب ہو

جاؤ گے۔''

''ہاں۔'' تمہارا ساتھ رہا تو میں اس بار بھی ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم پہلے بھی ایسے امتحانوں میں بیٹھے ہو۔''

''ہاں''۔ وہ ایک دم اداس ہو کر بولا۔ کئی بار میں ایسے امتحانوں میں بیٹھا ہوں اور کئی بار میں اُن میں کامیاب بھی ہو نکلا ہوں لیکن پھر بھی نوکری حاصل کرنے میں ناکام رہا ہوں۔''

"How sad" وہ بھی اداس ہو گئی۔ میں دُعا کروں گی کہ اس بار تمہیں ضرور نوکری ملے۔

''مجھے تمہاری دعاؤں کی ضرورت تو ہے بلکہ تمہاری دعاؤں کی ضرورت اس اہسپتال کے ہر مریض کو ہے۔ جب یہ مریض اپنے زخموں یا اپنی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو درد سے ٹوٹ کر چیختے ہیں تب مجھے لگتا ہے کہ دُنیا میں تمہارے جیسے اور ڈاکٹر راہول جیسے لوگ نہ ہوں گے تو ہم جیسے مریضوں کا کیا حال ہو گا؟۔ مرنے سے پہلے مرتے رہیں گے۔ لوگ اپنی اپنی کہانی لے کر دفن ہو جائیں گے یا جل کر راکھ ہو جائیں گے۔ کوئی اُن سب کی کہانیاں نہ سنے گا نہ لکھے گا۔

''ہر آدمی کی کہانی نہیں لکھی جاتی ہے وشال کیونکہ دنیا میں ہر آدمی وہ نہیں کرتا ہے جو تم نے کیا ہے۔

''ہاں مگر ہر آدمی کی ایک الگ الگ کہانی ضرور ہے۔ دلچسپ اور پُر اسرار'' وشال بولا'' اور ہر زندہ آدمی کا کوئی نہ کوئی سپنا ضرور ہے۔ جانتی ہو کل رات اس اہسپتال میں ایک مریض اپنے درد و کرب میں کسی رضیہؔ کو یاد کر رہا تھا۔ رضیہؔ تو نہ آئی ہاں اُس مریض کی رات اس کی آنکھوں میں کٹ گئی۔ یقیناً رضیہ اس کی محبوبہ ہو گی یا اس کی بہن یا پھر اس کی بیٹی لیکن ہر صورت میں اُس مریض کا رضیہ کے ساتھ کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور ہو گا اور تم جانتی ہو کہ ہر آدمی کا ہر ایک رشتہ اپنے اندر ایک کہانی ضرور لیے ہوتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو لیکن ابھی تم دنیا بھر کے لوگوں کے رشتوں اور اُن کے رشتوں کی کہانیوں کے بارے میں نہ سوچو بلکہ اپنے امتحان کی تیاری کرو۔''

وشال اپنے امتحان میں بیٹھنے کی تیاری میں تھا اور نیلما اُس کی کامیابی کے لیے دعا کرنے میں مصروف تھی۔ وہ دل و جان سے چاہتی تھی کہ وشال کو ایک اچھی سی نوکری ملے تاکہ وہ اپنے بے بس اور لاچار وجود کو پال سکے اور کبھی بھی وہ اپنی زندگی میں کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کو مجبور نہ ہو۔ کچھ دنوں میں وشال کا امتحان آیا تو نیلما اُسے کار میں بٹھا کر امتحان کے مرکز میں لے گئی اور جب تک وہ اندر رہا تب تک وہ کار میں بیٹھی بڑی بے صبری سے اس کا انتظار کرتی رہی۔ امتحان ختم ہونے کے بعد جب وہ نکلا تو تندرست اور جوان امیدواروں کے مقابلے میں وہ سب سے آخر میں تھا۔ جب تمام ہی امیدوار باہر نکلے تب وہ بیساکھی کے سہارے دھیرے دھیرے باہر چلا آیا۔ نیلما پہلے سے ہی اس کے انتظار میں تھی۔ اُسے کار میں اپنے برابر بٹھا کر وہاں سے لے جاتے ہوئے بولی۔

"بہت دیر لگا دی تم نے۔"

"ہاں" اپاہج ہوں نا میں۔"

"میرا مطلب یہ نہ تھا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تمہارا مطلب یہ نہ تھا لیکن میں نے صرف تمہارے سوال کا جواب دیا تھا۔"

"بھیا کہہ رہے تھے کہ کچھ دنوں میں وہ تم کو ایک نقلی ٹانگ لگوا دیں گے۔"

"نقلی تو بہر حال نقلی ہوتی ہے جس سے آدمی شاید چند قدم چل بھی سکے لیکن دوڑ نہیں سکے گا لیکن ہاں نیلما اس امتحان میں شاید میں سب سے آگے نکل جاؤں گا۔

"یعنی تمہارا پرچہ بہت اچھا ہوا ہے۔" وہ خوشی سے چہک اُٹھی۔

"پرچے تو میرے ہمیشہ اچھے ہی ہوتے رہے ہیں اور اکثر میں کامیاب بھی ہوتا رہا ہوں لیکن ہمیشہ میں بچھڑتا بھی رہا ہوں لیکن اس بار تو امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد نوکری کی بات کر رہا ہوں جس کی مجھے امید ہے۔

"تمہیں ضرور نوکری ملے گی۔"

"کئی سالوں سے میں یہی سُنتا آیا ہوں۔"

"صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔"

"میری نظروں میں یہ جھوٹ ہے۔ وہ فوراً بولا۔ ہارے ہوئے آدمی کے دل کو بہلانے والی بات ہے یہ بس۔ جیتنے والے آدمی کو صبر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے چاہیے اس نے وہ جیت کیسے بھی حاصل کی ہو۔ سب سے زیادہ تازہ اور میٹھے پھل وہی کھا جاتا ہے۔

اس کی باتوں میں اتنا زیادہ رنج وغم، درد والم اور ناامیدی تھی کہ نیلما کی روح بھی کانپ اُٹھی۔ اُس نے ہلکا سا جھک کر وشال کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پچھلے کئی دنوں میں اُس کی صحت میں کچھ سدھر گئی تھی۔ گالوں پر کچھ کچھ جوانی لوٹ آئی تھی۔ شانے بھی مضبوط ہوئے نظر آرہے تھے لیکن آنکھوں میں ابھی بھی خوشی کی چمک کا فقدان تھا۔ چمک تو دور کی بات اُن میں ویرانی ہی ویرانی تھی اور کچھ تھا تو ایک ٹانگ کی کمی تھی جو بہر حال کبھی بھی پوری ہونے والی نہ تھی چاہیے اس کی زندگی کا ہر چھوٹا بڑا سپنا بھی پورا کیوں نہ ہو؟۔ نیلما کے دل میں بس افسوس تھا۔!!

کچھ دنوں میں وہ کچھ اپنی محنت اور لگن سے، کچھ نیلما کے دیئے ہوئے حوصلوں سے، کچھ ڈاکٹر راہول کے سمجھانے سے کچھ زندہ رہنے کی آرزو سے اور کچھ اپنی واپس لوٹ آتی ہوئی صحت کے زور سے وہ بیساکھی کے سہارے ادھر اُدھر چلنے لگا۔ نیلما اور راہول سے اسے بہت اچھا سہارا ملا تھا۔ وہ اس کا ہر طرح سے خیال رکھ رہے تھے۔ وشال کو اُن کی بہت زیادہ عقیدت ہوگئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ اس کے لیے غیر نہ ہوں بلکہ اس کے کئی جنموں کے جانے پہچانے ہوں لیکن اس کے باوجود وشال اب ان پر زیادہ دیر بوجھ نہ بنے رہنا چاہتا تھا اس لیے وہ وہاں سے جانے کے بارے میں سوچنے لگا اور یہی بات جب اس نے نیلما سے کہی تو وہ بے چین ہو اُٹھی۔

"کیا سوچنے لگی؟۔" وشال نے پوچھا۔

"تمہارے جانے کے بارے میں۔"

"جانا تو ہے ہی مجھے۔"

"سو تو ہے لیکن کئی دنوں سے تمہارے ساتھ رہ کر ہم بھائی بہن یہ جیسے بھول ہی گئے تھے کہ ہم اس دنیا میں اکیلے ہیں۔ تمہارے جانے کے بعد پھر وہی سونا پن آجائے گا ہماری

دنیا میں۔ پھر سے ہم تنہا، پھر سے ہم اکیلے ہو جائیں گے۔

''میں تم لوگوں سے ملتا رہوں گا نیلما لیکن مجھے جانے کی اجازت دو۔''

''کہاں جاؤ گے؟''

''دیکھو قسمت کہاں لے جاتی ہے؟''

''بہت اچھی بات ہے۔'' نیلما فوراً بولی۔ ''یہ بھی نہیں پتہ کہ جانا کہاں ہے اور جا رہے ہو۔ ہاں تم اپنے گھر جانے کی بات سوچ رہے ہو تو میں تمہیں روکوں گی نہیں بلکہ خود تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گی۔

''گھر تو میں نوکری حاصل کرنے کے بعد ہی جاؤں گا۔''

''تو پھر جانے کی کیا جلدی ہے؟'' دروازے پر سے آواز آئی۔ وہاں سے ڈاکٹر راہول کھڑے تھے۔ وہ اندر آتے ہوئے بولے۔

''آپ اپنے گھر میں نوکری حاصل کرنے کے بعد ہی جانا چاہتے ہیں تو پھر یہاں سے جانے کی جلدی کیا ہے؟۔ میرے اہسپتال میں Receptionist کی جگہ خالی ہے جب تک آپ کو کوئی اچھی نوکری نہیں ملتی ہے تب تک آپ ادھر کام کریئے۔''

''ہاں۔'' نیلما فوراً بولی، کام کا کام بھی ہو گیا، دل بھی لگا رہے گا۔

راہول اور نیلما نے اسے جانے نہ دیا اور یوں میں ڈاکٹر راہول کے اہسپتال میں کام کرنے لگا۔ کام شروع ہو گیا تو مصروفیات کی وجہ سے اس کا بھی لگا دل بھی رہنے لگا۔ نیلما نے بھی اس کا پورا خیال رکھا بلکہ اب تو نیلما کے دل میں اس کی پوری جگہ بن گئی تھی لو لہ نیلما نے اپنے دل کی بات اس پر ظاہر نہ ہونے دی تھی۔ پہلے تو نیلما اس کو صرف ایک اجنبی مانتی تھی جو اس کی وجہ سے اپنے جسم کا ایک قیمتی حصہ کھو چکا تھا اس لیے نیلما نے اس کا سہارا بن جانے کے لیے اس کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کی اجازت بھی اس نے اپنے بھائی سے لے لی تھی۔ تب نیلما کے دل میں وشال کے لیے ہمدردی تو تھی جنون نہ تھا لیکن اب وہی ہمدردی جنوں میں بدل گئی تھی۔ پتہ بھی نہ چل پایا تھا کہ ہمدردی کے اس پیڑ پر کب اور کیسے محبت کا پیوند لگا تھا اور کیسے اتنی جلدی وہ پیڑ بہت مضبوط اور تناور ہو گیا تھا۔ اب اُسے وشال میں ہی اپنا مستقبل نظر آ رہا تھا اس لیے وہ جی اور جان سے چاہتی تھی کہ وشال

امتحان میں کامیاب ہو جائے اور اسے نوکری بھی مل جائے تا کہ وہ اس پر اپنے دل کی بات ظاہر کر سکے۔ کئی دنوں سے اس نے وشال کو ساتھ لے کر اپنی آنکھوں میں کچھ سپنے سجائے تھے اور وہ سپنے اتنے حسین تھے کہ ان کے سایوں میں اُسے وشال کے نامکمل جسم کا کٹا ہوا حصہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس محبت نے اس پر ایسا جادو کیا تھا کہ اُسے کبھی یہ سوچنے کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوئی تھی کہ وشال جیسے ناکارہ آدمی کے ساتھ زندگی کے سفر پر جانا کتنا مشکل اور کٹھن ہوگا؟۔ اُس نے کبھی یہ بھی نہ سوچا تھا کہ اپنے ہمسفر سے وہ کسی بھی مقام پر سہارے کی اُمید نہیں کر سکتی ہے بلکہ خود اُسے ہی اپنے ہمسفر کا سہارا بن کر تمام منزلیں طے کرنا ہوں گی۔

اہسپتال میں وشال عام طور پر مریضوں کی باتیں سنتا رہتا تھا اور پھر وہی باتیں نیلما کو بھی سناتا رہتا تھا۔ ایک بار وہ نیلما کو اہسپتال کے اندر لے گیا اور اسے نوجوان لڑکی کے سامنے کھڑا کر دیا۔ وہ لڑکی لاجواب حسن کی کھلی مثال تھی۔

''اس لڑکی کو دیکھو'' وشال بولا۔ چاند بھی شرما جائے گا۔''

''ہاں''۔

''یہ مالا ہے بیس سال کی عمر ہے اس کی۔'' وہ وہاں سے ہٹتے ہوئے بولا، اور دیکھو تو یہ اپنے گھر کی چھت سے گر کر اپنی ہڈیاں تڑوا چکی ہے۔''

''اوہ۔'' نیلما کو مالا کے بارے میں سن کر دُکھ ہوا۔

''جو میں نے کہا...... وہ تم مان گئی؟''۔

''ہاں تو......؟''۔

''سب نے مان لیا لیکن تم نے اس کی آنکھوں میں جھانک کے دیکھا ہوتا تو تمہیں اس کی آنکھوں میں کچھ سپنے ضرور نظر آئے ہوتے۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو۔؟''

''یہ کہ یہ جھوٹ ہے کہ وہ اپنے گھر کی چھت سے گر گئی ہے۔''

''تو پھر سچ کیا ہے۔؟''

''سچ یہ ہے کہ اُس نے خود گھر کی چھت سے جان بوجھ کر گرایا ہے،'' وشال نے تیزی

سے کہا تو نیلما حیرت سے کبھی وشال کو تو کبھی مالا کو دیکھتی رہی۔ اُس نے مالا کے قریب جا کر اس کے بال سنوارتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے بتاؤ۔ سچ کیا ہے؟"۔

"اُس کی آنکھوں میں آنسوں بھر آئے لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی، نیلما نے تڑپ کر پوچھا۔ "کیوں کیا تم نے ایسا؟"۔

"وہ لوگ...... وہ لوگ ہماری شادی نہ ہونے دیں گے۔ وہ مر جائے گا تو میں بھی جی کر کیا کروں گی؟۔ مالا پھوٹ پڑی۔

"لکھو" وشال فوراً ہی نیلما سے بولا۔ لکھو کہ محبت میں کسی نے خودکشی کی کوشش کی۔ لکھو کہ اونچ نیچ، ذات پات اور امیری غریبی نے دونوں کو ملنے نہ دیا۔ لکھو کہ اس سماج کا یہ رواج ہے کہ محبت کرنے والوں کے درمیان کھڑا ہو جاتا ہے۔"

نیلما کچھ نہ بولی۔ خاموشی سے مالا کے بال سنوارتی رہی۔ وشال پھر بولا۔ تم قلم کار ہو، تمہارا فرض ہے کہ تم چھوٹی بڑی، اچھی بُری ہر کہانی لکھو۔ وشال نے اُسے فالتو نہ جانے دیا۔ وہ اُسے دوسرے کمرے میں ایک بزرگ مریض کے پاس لے گیا۔ بولا

"یہ ہے اس شہر کے ایک بزرگ مراری لعل۔ عمر اسی کے قریب، چار شادی شدہ بیٹے ہیں ان کے۔ ایک ہفتہ پہلے گھر کی رسوئی میں گر کر ان کی بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

"اور تم ابھی یہ کہو گے کہ یہ گرے نہیں گرائے گئے ہیں یا پھر انہوں نے جان بوجھ کر خود کو گرا دیا۔

"نہیں۔ یہ خود گرے ہیں۔ وشال بولا۔ لیکن سوچو نیلما اسی سال کی اس عمر میں ان کے چار بیٹوں اور بہوؤں کے ہوتے ہوئے بھی ان کو رسوئی میں جانے کی ضرورت کیوں آ پڑی؟"۔

نیلما نے چونک کر وشال کی طرف دیکھا۔ بولا۔ یہ کہانی بھی لکھ لو۔ دیکھ لو ان کو۔ ان کی آنکھوں کے آنسوں دیکھ لو جو کہہ رہے ہیں کہ یہ رسوئی میں صرف اس لیے گئے تھے کہ اپنے لیے ایک روٹی حاصل کر سکیں۔ شاید صبح سے یا پھر شاید رات سے ہی یہ بھوکے رہے ہوں گے۔"

نیلما کا دل رو اُٹھا۔ دنیا میں ایسی بھی کہانیاں موجود ہیں اس کو آج ہی پتہ چلا تھا۔ ایسے حادثوں کے بارے میں اس نے پہلے کبھی نہ سُنا تھا اور اگر سُنا بھی تھا تو توجہ نہ دی تھی۔

وشال بولا۔

"تم یہ تو نہیں سوچ رہی ہو کہ میں تمہیں ان لوگوں سے کیوں ملا رہا ہوں۔"

"نہیں، یہ میں سوچ رہی ہوں کہ تم نے مجھے ان لوگوں سے پہلے کیوں نہ ملایا؟۔

" ایسے لوگوں کو تلاش کرنا، اُن سے ملنا، اُن کے دُکھ درد سُن لینا، اُن کی کہانیوں کو کہانیوں کا روپ دینا تم جیسے ادیبوں، قلم کاروں اور شاعروں کا کام ہے کیونکہ تم لوگوں کا پیشہ لکھنا ہے۔ یہ دنیا تو سو بار ہیر رانجے، شرین اور فرہاد، لیلیٰ مجنون کے قصے پڑھ چکی ہے اور تم قلم کار بھی محبت کی اُن ہی داستانوں کو نئے رنگ و روپ دے کر دُہراتے رہتے ہو۔ کیا فائدہ ہے اس کا؟۔ لکھنا ہے تو آج کی سچائی لکھو۔ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ساتھ خود کو بدلو۔ سمجھنے کی کوشش کرو کہ اس زمانے کے رانجے، فرہاد، اور مجنون اور اس زمانے کے نوجوان لوگوں میں کیا فرق ہے۔ آج کا رانجا اپنی ہیر سے جُدا ہو تو بھی فون سے بات کر سکتا ہے، آج کے فرہاد کو پہاڑ والی نہر کھودنے کی ضرورت نہیں۔ آج کا فرہاد ایک دھماکے سے پہاڑ کے پہاڑ گرا سکتا ہے اور آج کا مجنون تو صحرا میں لیلیٰ لیلیٰ پکارنے کے لیے مجبور نہیں۔ لیلیٰ کو بلانے کے لیے اس کے پاس سو طریقے ہیں۔ پھر آج کے لوگوں کو محبت کے قصے سنانے یا پڑھانے سے کیا فائدہ۔ آج کے لوگوں کو آج کے سماج میں تبدیلی چاہئے اور وہ تبدیلی لانے میں تم جیسے قلم کار لاکھوں کہانیاں لکھ کر اپنا حصہ دے سکتے ہو۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"نیلما۔" وہ اُسے اہسپتال سے باہر لے جاتے ہوئے بولا۔ میری باتوں کا بُرا نہیں مان لینا۔

" ارے نہیں۔" وہ فوراً بولی۔ تم نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔"

اگلے ہی دن وہ شال کو کاغذ کے کچھ پنے دے گئی، بولی۔ دو چھوٹی سی کہانیاں ہیں، پڑھ لینا۔

وشال نے نیلما کی وہ دونوں کہانیاں پڑھ لیں۔ وہ نیلما کی نہیں بلکہ مالا اور مراری لعل

کی کہانیاں تھیں، کہانیوں میں کئی سوال تھے جو بہر حال حل طلب تھے۔ اُن کا حل سماج سے ہی مانگا گیا تھا۔ وشال کو نیلما کا طرزِ تحریر بہت اچھا لگا۔

کچھ دنوں میں وشال کے امتحان کا نتیجہ نکل آیا تو کامیاب امیدواروں میں وشال کا نام دیکھ کر نیلما خوشی کے مارے پاگل ہوتے ہوئے بچی، اُسے وشال کی کامیابی کا یقین تو پہلے ہی تھا لیکن پھر بھی اُسے کامیاب دیکھ کر اُسے لگا کہ جیسے قارون کا پورا خزانہ اس کے ہاتھ لگا ہو۔ وہ فوراً گھر چلی آئی۔ وشال اس وقت دوپہر کے کھانے کے لیے گھر میں موجود تھا۔ نیلما کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیسے وشال کو اس کی کامیابی کی خبر سنا دے؟ خوشی کی حد تھی کہ وہ نیلما کو اُس کی دھڑکنوں اور مُسکراہٹوں پر قابو نہ رکھنے دے رہی تھی۔ وشال جان چکا تھا کہ نیلما کے دل میں بتانے کے لیے کوئی ضروری بات ہے لیکن دل کی بات بیان کرنے کے لیے اُسے الفاظ نہ مل رہے ہیں۔ وہ بولا۔

"شاعروں اور ادیبوں کے پاس کسی بھی جذبے کو بیان کرنے کے لیے کبھی بھی لفظوں کی کمی نہیں ہوتی ہے۔ پھر تم کیوں الفاظ کی تلاش میں بھٹک رہی ہو؟"

"نیلما نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ فوراً بولا۔ اس طرح چونک اُٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری زبان کچھ انہونی کہنے کو مچل رہی ہے۔

"وہ اس کے قریب آکر بولی۔ تم جادوگر ہو کیا؟"

"جادوگر نہیں بلکہ سوداگر ہوں میں۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ تم مجھے تمہاری خوشی کی وجہ بتا دو تو بیان کرنے کے لیے میں تمہیں الفاظ دوں گا۔

وہ کھکھلا کر ہنس پڑی۔ پہلی بار وہ وشال کے سامنے ہنس پڑی تھی۔ وشال اُسے دیکھتا رہا۔ بہت خوبصورت تھی اس کی وہ ہنسی۔ تبھی وشال کو مذاق سوجھا۔ وہ فرش پر اِدھر اُدھر کچھ کھوجنے لگا۔ نیلما نے اپنی ہنسی روک کر پوچھا۔

"کیا کھوج رہے ہو؟"

"پھول"۔

"پھول، فرش پر کہاں سے آئے۔"

"تمہاری ہنسی سے گر کر۔ کیا خوبصورت تھے پھول؟۔ گلاب، کنول اور......؟"

''مذاق کررہے ہو؟''۔

''نہ......نہیں تو۔ دراصل آج پہلی بار تمہاری ہنسی کے پھول دیکھے ہیں۔ تم کیوں ہنسی تھی؟''۔

''تمہاری بات کو لے کر''۔ وہ فوراً بولی۔ کیا بات کہی تھی تم نے! میرے دل کی بات مجھ سے ہی جان کر وہی بات بیان کرنے کے لیے تم مجھے الفاظ دوگے۔

''بھئی سوداگر جو ہوں میں۔ بہر حال تمہاری آنکھوں میں یہ کس خوشی کی قندیل جل رہی ہے؟''۔

''اس خوشی کی کہ تم نے میری لاج رکھی ہے۔'' وہ بہت سنجیدہ ہو کر بولی۔ میری عزت رکھی ہے۔ بہت خوشی دی ہے تم نے مجھے کیونکہ تم امتحان میں پاس ہو گئے ہو۔''

''اتنی زیادہ خوشی؟''

''کیا اس موقعے پر مجھے خوش نہ ہونا چاہئے؟''۔

''تم میری خوشی میں شامل ہو اس سے بڑی خوشی کی بات میرے لیے کیا ہو سکتی ہے؟۔ لیکن نیلما اتنی بھی خوش نہ ہو جاؤ کہ بعد میں تم اس خوشی کو برقرار نہ رکھ سکو۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی''۔

''ابھی تو یہ خوشی ادھوری ہے نیلما۔ میری طرح ادھوری اور نامکمل۔ اُدھوری خوشی اور اُدھوری آدمی کا کوئی مطلب نہیں ہوتا ہے جب تک وہ مجھے نوکری نہ دیں تب تک میں خوش ہوا بھی تو کیا ہوا۔؟''

''ہاں'' اس کی بات سن کر وہ افسردہ سی ہو گئی۔ بولی صرف امتحان میں کامیاب ہونے سے نوکری نہیں ملتی ہے کیونکہ تمہاری طرح اور بھی لوگ اس امتحان میں کامیاب ہو گئے ہوں اور وہ سب نوکری کی اُمید بھی کر رہے ہوں گے اور جتن بھی لیکن وشال اس ادھوری خوشی کو پورا کرنے کے لیے ہم کو بھی کوئی راستہ تلاش کرنا چاہئے۔ اگر ہم کوئی پیسہ خرچ کریں تو......؟''

اُداس تو وہ پہلے سے ہی تھا۔ دراصل نیلما نے جب اُسے پہلی بار دیکھا تھا تب سے ہی نیلما نے اُسے اُداس پایا تھا جیسے آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرنے والے کسی پنچھی نے

اپنے پر کھو دیئے ہوں اور وہ تنہا کسی چھت پر گرا خاموشی سے بے بس پڑا ہو۔ نیلما کی اس بات سے وہ اور زیادہ اُداس ہو گیا جیسے موسم اور حالات کی نامہربانیوں سے اُس پنچھی کی وہ چھت بھی ڈھے گئی ہو۔ لگا وہ ابھی رو پڑے گا اور پھر روتا ہی رہے گا۔ آنکھیں گیلی ہوتی گئیں، لگا اُن سے ابھی کرشنا اور کاویری بہہ نکلے گی لیکن پھر وہ زبردستی ندیوں کے پانیوں کو روکتے ہوئے بولا۔

''کوئی پیسہ خرچ نہیں کرنا ہے؟''۔

''لیکن......؟''۔

''نیلما''۔ وہ فوراً بولا۔ تم فکر نہ کرو، نوکری مل جائے گی۔

''لیکن کیسے؟''۔

''میں اس کے لیے اکیلے پہلے ہی رشوت دے چکا ہوں۔''

''کتنی......؟''۔

''وہ میں تمہیں کام ہو جانے کے بعد بتا دوں گا'' وہ اپنی بیساکھی کے سہارے وہاں سے جانے لگا لیکن پھر رُک کر بولا۔

''نیلما کہیں ایسا نہ ہو کہ انٹرویو Interview کے لیے میرے بُلائے کی چھٹی میرے گھر پر چلی جائے۔''

''ایک بات بولوں؟''۔ وہ اُس کے قریب آ کر بولی۔ تم مجھے اپنے گھر کا پتہ نہ بتانا چاہتے ہو تو بے شک نہ بتا دو لیکن تم اپنے گھر میں یہاں کا پتہ ضرور لکھ دو۔ کوئی خط تمہارے نام سے پہنچ جائے تو وہ روانہ کر سکتے ہیں یہاں۔''

وہ خاموشی سے کچھ دیر تک اندر ہی اندر سوچتا رہا تو نیلما بولی۔ ''یا تم یہ بھی نہیں چاہتے ہو کہ تمہارے گھر والے تمہیں ڈھونڈتے یہاں چلے آئیں۔

وہ خالی نظروں سے اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کے بچے ہوئے حصے کو دیکھتے ہوئے بولا۔'' میری تو پھر بھی ایک ٹانگ ہے نیلما لیکن میرے گھر کے کسی بھی در و دیوار میں کوئی ٹانگ نہیں ہے جو وہ میرے لیے آئے ہوئے کسی خط کو تمہارے پتہ پر روانہ کرنے کے لیے ڈاک گھر چلے آئیں۔

''تو........تمہارا مطلب ہے کہ واقعی تمہارا کوئی نہیں ہے۔''

''ہے نا''۔ وہ نفرت سے بولا'' میری ذلت، میری شکست، میری ہار، میری ایم۔ اے کی ڈگری، میری نا اُمیدی، میری پیاس، میرے سپنے، میری کٹی ہوئی ٹانگ کا بچا ہوا حصہ، میرا بھائی، میری بھابھی اور......'' وہ کہتے کہتے رُک گیا جیسے نفرت کے لاوے کے باقی حصے کو وہ اپنے اندر کے آتش فشاں میں محفوظ رکھنا چاہتا ہو۔

''رُک کیوں گئے؟'' نیلما نے فوراً پوچھا، اور کون ہے؟۔

''اور جو بھی ہے اس کے نام کے سامنے میں ذلت اور شکست کے لفظ نہیں لگانا چاہتا ہوں۔''

''مگر وہ اور کون ہے؟''

''تم جان کر کیا کرو گی؟''

''مجھے اُس کا نام سن کر خوشی ہوگی۔''

''وہ اور......؟'' وہ کچھ سوچ کر بولا۔ سمجھ لو کہ وہ تم ہو۔ وہ تیزی سے وہاں سے نکل گیا تو نیلما کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ وہ کب سے وشال کے نام کے ساتھ اپنا نام جوڑنا چاہتی تھی۔ ایسا ہی وشال بھی چاہتا ہے یہ جان کر اُسے لگا کہ جیسے اُس کے من کی مُراد پوری ہوگئی ہو، اُس نے پہلے تو وشال کے لیے اُس کے امتحان کے بُلاوے کی چھٹی دستی حاصل کی تھی اب نوکری کے لیے Interview کا بُلاوا بھی اُس نے دستی حاصل کیا اور پھر انٹرویو کے دن وہ اُسے خود کار میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ بہت سنجیدہ اور خاموش تھی۔ اندر ہی اندر وہ ڈر رہی تھی کہ اگر وشال کو نوکری نہ ملی تو اُس کا کیا ہوگا؟۔ وشال کی نوکری کے ساتھ اُس نے اپنے بھی کئی خواب جوڑ دیئے تھے اور وہ کسی بھی صورت میں اُن خوابوں کو ٹوٹ جانے نہ دینا چاہتی تھی۔ اُس نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ وشال ایک اپاہج ہے جس کے کاندھے کسی کو سُہارا نہ دے سکیں گے بلکہ وہ خود اوروں کے سُہارے کا مُحتاج رہے گا۔ ہر مرد کے کاندھے تو عورت کی زندگی کا سُہارا ہوتے ہیں لیکن ہر اپاہج کے کاندھے تو خود دوسروں سے سُہارے مانگتے پھرتے رہتے ہیں۔ نیلما نے بھی اس پر غور نہ کیا تھا بلکہ اُس نے بس وشال کو چاہا تھا۔ جانے کیسے یہ کیسی آگ دل کی بستی کے کس کونے سے بھڑک اُٹھی تھی کہ اُس کی آگ کی آنچ

اور جلن سے وہ مدہوش ہوگئی تھی۔ جانے اُس آگ نے کیسے اُسے کسی بھی طریقے سوچنے سے منع کیا ہوا تھا کہ بس وشال اس کے ذہن و دل کے ہر تار پر چھایا ہوا تھا۔ وشال کی ہر خوشی اُسے اپنی خوشی لگ رہی تھی۔ وشال کی ہر خوشی پر اُسے اپنا حق لگ رہا تھا جیسے اُن کی ہر چیز سانجھی ہو، مشترکہ ہو۔

وشال کا انٹرویو بہت دیر تک چلتا رہا اور نیلما بڑی بے چینی سے باہر اُس کا انتظار کرتی رہی تاکہ وشال باہر نکلے اور نکلتے ہی وہ اس کے کانوں میں اپنی کامیابی کی خبر کا رس گھول دے۔ وشال جب باہر نکلا تو اس کے لبوں پر ایک دلنشین مُسکراہٹ تھی کہ جیسے کہہ رہا ہو کہ دیکھ نیلما میں جیت چکا ہوں۔ میں اپنی ذلت اور ناکامی کو بہت پیچھے چھوڑ کر آیا ہوں۔ دیر سے ہی میں نے یہ جنگ جیت لی ہے۔ نیلما کے لیے اس کی مُسکراہٹ جیسے اُس کی من چاہی خوشیوں اور مُرادوں کا پیش خیمہ اور پیغام تھی۔ وہ دوڑ کر اس کے پاس آ گئی۔ بے تابی سے اُس نے پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

''سب ٹھیک ہوا ہے''۔

"Thank God"۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھ کر شکر ادا کیا کیونکہ اُس کے من کی مراد پوری ہوگئی تھی۔ گھر کی طرف آتے ہوئے نیلما نے پھر اُسے اس بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ اب میں نے نوکری حاصل کرنے کا آسان طریقہ سیکھ لیا ہے۔ بس اب تم جان لو کہ وہ طریقہ مجھے نوکری دلوا ہی رہا ہے۔''

''تو تم وہ طریقہ مجھے بھی بتادو وشال''۔

وشال کے چہرے کی دمک، لبوں کی مُسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک جیسے ایک دم ختم ہوگئی۔ جیسے نیلگوں آسمان پر چمکتے خورشید کو اچانک ہی کیسی کالی گنگھور گھٹا نے گھیر لیا ہو۔ لگا کہ وہ اندر ہی اندر رو رہا ہے۔ نیلما اُسے دیکھتی جا رہی تھی تاکہ اُس کے بارے میں کچھ جان سکے لیکن اس بار بھی وہ بہر حال اپنی کوشش میں ناکام تھی۔ پردوں کو ہٹانا آسان نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ پردہ کرنے والے ہی سوچ کر پردے کرتے ہیں کہ کسی کو چھپانا ہے ورنہ پردہ

کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ وہ پردے ہٹائے بغیر ہی بولا۔

''وہ طریقہ جان کر تم کیا کروں گی نیلما؟ تم تو نوکری کی تلاش میں نہ ہو اور نہ ہی تمہیں اس کی ضرورت ہے۔''

''میری بہت سے سہیلیوں کو نوکری کی تلاش ہے۔'' وہ ٹھیک گھر کے گیراج میں کار کو روکتے ہوئے بولی۔ 'اُن کو ہی بتادوں گی وہ طریقے۔''

وشال حیران تھا کہ وہ نیلما سے کیا کہے! اُس نے جو طریقہ اپنایا تھا وہ غیر فطری تھا۔ غیر انسانی تھا، غیر قانونی تھا اور وہ طریقہ وہ نیلما کو بتانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اُسے ڈر تھا کہ وہ طریقہ سُن کر نیلما کے دل کو بہت گہری چوٹ پہنچے گی۔ وہ اپنی بیساکھی سنبھالتے ہوئے کار سے نکلنے کی تیاری کرتے ہوئے بولا۔ ''دو ہی طریقے ہیں۔''

''جلدی سے کہدو۔''

''رشوت یا سفارش۔''

''ہاں۔'' نیلما اُس کے ساتھ چلتے ہوئے گھر کی طرف جاتے ہوئی بولی۔ ضرور تم نے کسی بڑے آدمی کی سفارش لی ہوگی اس لیے تم اتنے زیادہ پُر اُمید ہو۔''

''نہیں'' گھر کے اندر پہنچ کر بیساکھی ایک طرف کر کے وہ ایک کرسی کے سہارے کھڑا ہو کے بولا۔ ''میں غریب اور بے سُہارا آدمی کسی بڑے آدمی کے پاس کیسے پہنچ سکتا ہوں۔''

''تو ضرور تم نے کوئی موٹی رقم رشوت میں دی ہوگی۔''

''تم جانتی ہو کہ میں کئی دنوں سے یہاں پڑا ہوں اس لیے رشوت کیسے دے سکتا تھا؟۔''

''نہیں'' ''میں تمہارے یہاں آنے سے پہلے کی بات کر رہی ہوں۔''

وہ نیلما سے دامن چھڑانا چاہتا تھا لیکن وہ اُس کا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔ اُس کی باتوں سے وشال چڑھ سا گیا تھا اس لیے وہ جل کے بولا۔ ہاں رشوت دی ہے میں نے۔

''کتنی؟۔''

نیلما کے اس سوال پر اُس کی آنکھوں میں آنسوں بھر آئے اور اس بار اُس کے آنسوں اُس کے روکے سے بھی نہ رُکے۔ شاید اُس کے من کے ساگر نے جوش کھا لیا تھا اس

لیے صبر کے تمام باندھ ٹوٹ گئے تھے۔ نہریں سیلاب زدہ ہو کر ہر باندھ توڑتی ہوئی بہہ نکلیں۔ بھاڑھ کا ذرا سا پانی اس کے حلق میں بھی بھر گیا تھا۔ بھری ہوئی آواز میں بولا۔ نہ پوچھو نیلما کہ میں نے کتنی بڑی اور کتنی زیادہ رشوت دی ہے۔ تم نہ سُن سکوگی۔

''تم مجھے چھوٹے دل والی جانتے ہو۔''

تم تو سمندر سے بھی بڑا دل رکھتی ہو نیلما اسی لیے تم ڈوبتے ہوئے لوگوں کو پار لگانے کا ذمہ لیتی ہو لیکن نیلما کبھی ایسا بھی وقت آتا ہے کہ اتنا بڑا سمندر بھی کسی بپھرے ہوئے مُنہ زور طوفان سے اپنے آپ کو نہیں سنبھال پاتا ہے۔ اس لیے تم مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ تم خود کو سنبھال نہ سکوگی۔''

''تم یہ کیوں نہیں کہتے ہوں کہ تم اپنے بارے میں مجھے کچھ نہیں کہنا چاہتے ہو؟۔ تم یہ کیوں نہیں کہتے ہو کہ تم اب تک اس نیلما کو اپنا نہیں مانتے ہو اس لیے اپنی کوئی بھی بات اسے بتانا نہیں چاہتے ہو؟۔ تم آج تک نیلما کو سمجھ نہ پائے ہو۔ ہمارے درمیان جو رشتے ہیں اُن کو جان نہ پائے ہو۔ نیلما اُس کا ہر راز جان لینا چاہتی تھی اس لیے اُس نے وشال کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ فوراً بولا۔

''رشتوں کی بات میرے سامنے نہ کرو نیلما کیونکہ رشتوں کی ہر سچائی مجھے معلوم ہے۔ میرا ایک سگا بھائی ہے۔ میرے سے بڑا جس کو میں میرے باپ کی طرح مانتا تھا اور میں میری بھابھی کو میری ماں کی طرح مانتا تھا اور انہوں نے میرے ساتھ جو رشتے نبھائے وہ مجھے معلوم ہے۔ بھابھی تو پھر بھابھی ہے، اُس نے میری کوئی خبر نہ لی مجھے دُکھ نہیں لیکن میرے سگے بھائی نے جو میرے ساتھ کیا میں جانتا ہوں اپنے ایک چھوٹے سے مطلب کے لیے دلالی کی کوشش کی۔ میری خوشیوں کی اور جب میں نے یہ نہ ہونے دیا تو ناطہ توڑ کر الگ ہو گیا، میرے سے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ مجھے اُس کے سُہارے کی ضرورت ہے کیونکہ میں پڑھا لکھا بے روزگار ہوں۔ مجھے رشتوں کی قدر نہیں ہے۔ ہاں قدر ہے مجھے تو بس پیار کی ہے۔ تم جاننا چاہتی ہو نا کہ نوکری حاصل کرنے کے لیے میں نے کیا رشوت دی ہے تو سن لو۔ کلیجے پر پتھر رکھ کر سن لو۔ یہ نوکری حاصل کرنے کے لیے میں نے کسی کو پیسہ نہیں دیا ہے، سونا نہیں دیا ہے، چاندی نہیں دی ہے بلکہ اپنی ٹانگ دی ہے۔''

''ٹانگ دی ہے۔'' وہ اس کی بات نہ سمجھ سکی تھی۔

''ہاں اپنی ٹانگ دی ہے میں نے!! وہ نفرت اور غصّے سے بولا۔'' اپنی ٹانگ یہ دیکھو۔ وہ اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کا بچا ہوا حصہ اُسے دکھا کر بولا۔'' یہ ٹانگ دی ہے میں نے۔ جان بوجھ کر میں نے خود کو جسمانی طور پر معذور بنا دیا ہے کیونکہ میرے پاس نوکری حاصل کرنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔''

''نہیں۔'' وہ سر سے پاؤں تک لرز اُٹھی۔ لگا جیسے پوری دُنیا گھوم رہی ہے۔ بڑی مشکل سے، بڑے جتن سے وہ خود کو گرنے سے بچاتی رہی۔ اُس کی حالت سے بے خبر وشال چیخ کے بولا۔''

''ہاں سچ کہہ رہا ہوں میں۔ خراج دیا ہے میں نے۔ رشوت دی ہے میں نے؟۔

''یہ رشوت نہیں ناانصافی ہے جو تم نے اپنے ساتھ کی ہے۔'' وہ روتے ہوئے بولا۔

''ناانصافی......؟'' وہ بھی اپنے ساتھ؟۔ نیلما اِس ناانصافی کا مطلب تم نہ سمجھو گی وہ لوگ سمجھیں گے جن کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا ہے ناانصافی ہوتی ہے۔ اُن لوگوں میں سے میں بھی ہوں۔ میں نے وہی کیا جو میں نے کرنا چاہیۓ تھا۔

''کیوں......؟'' آنسوں چھلکاتے ہوئے اُس نے پوچھا۔ کیوں کیا تم نے ایسا؟۔ ایسا کرنے سے پہلے تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ زندگی کتنی کِٹھن اور دُشوار ہے؟ کیوں کیا تم نے ایسا؟۔

''اور کیا کرتا؟۔'' وہ تلخی سے بولا۔ کسی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر پوری عمر بھیک مانگتا پھرتا یا ڈاکے ڈالتا رہتا؟ کتنے ہی امتحانوں میں بیٹھا ہوں اور کتنے ہی انٹرویو لئے اور دیئے میں نے اور کتنی بار مجھے اُمید ہوئی، کتنی بار مجھے یقین ہوا کہ مجھے نوکری ملے گی لیکن ہر بار میری اُمیدوں پر اور میرے یقین پر پانی پھر گیا؟۔ کتنی ہی بار اپنے خیالوں کے گھروندوں پر میں نے کسی کو دولہن بنی، گھونگھٹ نکالے، شرماتے، لجاتے ہوئے دیکھا کتنی ہی بار میرے دل نے آرزو کی کہ آگے بڑھ کر اپنے خوابوں کی دولہن کا گھونگھٹ اُٹھا کر میں وہ روہیلا چاند چھو کے دیکھ لوں جس کی میری روح نے تمنا کی تھی لیکن ہر بار تمنا تڑپتی رہی اور خواب کبھی پورے نہ ہوئے!!۔ وہ دیوار کے سہارے چلتے ہوئے نیلما کے قریب آ گیا۔ اُس کی

آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری تو آنکھوں میں آنسوں ہے نیلما۔ ذرا کچھ دیر کے لیے ان کو خشک کر لو ورنہ اپنے آنسوں کے جھالوں میں تم میری آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے پانی کو نہ دیکھ سکو گی اور بولو نیلما کیا کرتا میں اُس زندگی کا جس کی ہر تمنا، ہر آرزو گھٹتی رہے اور نیلما تم شاید نہیں جانتی ہو کہ جب تمنائیں اور آرزوئیں پوری نہیں ہوتی ہیں تب آدمی کی حالت کیا ہو جاتی ہے۔؟''

نیلما بس روئے جا رہی تھی۔ اُس کے دل میں طوفان اُمڈتے آرہے تھے اور اُن سارے طوفانوں میں وہ معمولی تنکوں کی طرح اڑتی جا رہی تھی۔ اُسے اپنا وجود ڈولتا، بکھرتا محسوس ہو رہا تھا۔ وشال پھر بولا۔

''میں بہت دن چپ رہا کیونکہ میں تمہارا دل نہ توڑنا چاہتا تھا لیکن آج تم نے ضد کی تو میں نے تم کو سب کچھ بتا دیا۔ مجھے بچپن سے گھر میں اور اسکول میں بتاتا گیا تھا کہ میں پڑھائی کی طرف زیادہ سے زیادہ دھیان دوں۔ کتنی ہی بار کبھی پیار سے، کبھی دُلار سے، کبھی سمجھا کر، کبھی ڈر کر مجھے ہر طرف سے اس کے لیے اُکسایا گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ پڑھ لکھ کر مجھے نوکری ملے گی اور اُس نوکری سے مجھے میری روٹی ملے گی۔ سماج میں جگہ اور عزت ملے گی اور اُس نوکری کو اپنا حدف بنا کر میں نے کتنی ہی راتیں جاگ جاگ کر گزاریں ہوں گی تاکہ میں زیادہ سے زیادہ پڑھ سکوں۔ میں ہر سال اول آتا رہا اور لوگ مجھے کہتے رہے کہ میں ایک دن ایک بڑا افسر بنوں گا لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ جتنی بڑی نوکری کی آرزو کی جائے اتنی ہی بڑی رشوت دینا پڑتی ہے۔ میرے پتا جی اپنی راہ چلدیئے۔ بھائی نے مُنہ پھیر لیا اور ماں نے سب کچھ سامنے رکھ دیا۔ میں نے جو حوصلہ نہ ہارا اور اپنے حوصلے سے میں ایم۔ اے ہو گیا۔ سوچا کہ اب ٹھیک پڑھائی ہو گئی۔ اب مجھے نوکری ملے گی اور اُس نوکری سے مجھے روٹی ملے گی لیکن کتنی ہی بار اُن ظالم لیٹروں نے مجھ سے میرے حصے کی روٹی چھین لی اور اُن کو دی جو اُسے خرید سکے۔ میں بے بسی سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ تب مجھے اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ میں خود کو اپاہج بنا ڈالوں کیونکہ زندگی کی دوڑ میں نہ سہی لیکن کسی بھی مقابلے کے امتحان کی دوڑ میں میں اپاہج بن کے بھی حصہ لے سکتا ہوں اور مجھے یقین بھی تھا کہ میں وہ دوڑ جیت جاؤں گا کیونکہ اپاہج میرا صرف جسم ہوگا، میرا ذہن نہیں اس امتحان میں

کامیاب ہونے والے اُمیدواروں میں سے کچھ کو دی جانے والی نوکریوں کے ذریعے روٹی بانٹ لینے والے فرش کے ناخداؤں نے شاید ترس کھا کر چار اسامیاں اپاہجوں کے لیے مخصوص رکھی تھیں اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ میں خود کو اپاہج بنا لوں گا روٹی بانٹ لینے والے وہ ناخدا مجھے میرے حق کی روٹی نہ دیں نہ سہی، ناکارہ اور اپاہج ہونے کے ناطے مجھ پر ترس کھا کر ضرور دیں گے۔

نیلما کسی بن جل مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ وشال کی وہ المناک کہانی سُن کر پتھر کا جگر رکھنے والا کوئی درندہ بھی تڑپ سکتا تھا۔ پھر وہ اسے پیار کرنے والی ایک نازک سی لڑکی تھی۔ وہ یہ کہانی سن کر اندر ہی اندر ٹوٹ رہی تھی۔ وشال کی کہانی میں درد ہی درد تھا اور اُس کہانی کا ایک ایک لفظ نیلما کے سینے پر ایک ایک ہتھوڑا مار رہا تھا۔ وہ روتی اور پھر روتی ہی رہی۔ ایسا اُس نے کبھی نہ سُنا تھا، کبھی نہ دیکھا تھا، کبھی نہ پڑھا تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ آگے بڑھ کر وشال کی آنکھوں کا ہر آنسوں پونچھ لے اور اسے جیون کی ہر خوشی دے۔ اُسی وقت وشال پھر بولا۔

"رومت نیلما۔ اگر رونے سے تقدیریں بدلتی ہوتی تو شاید آج میری یہ حالت نہ ہوتی۔ کیونکہ بہت روچکا ہوں میں۔ دیکھ مجھے۔ اب میں نہیں روتا ہوں کیونکہ ہنسنے کا موقعہ ملا ہے مجھے۔ ارے میں تو کہتا ہوں کہ میں دھنی ہو گیا ہوں۔ ایک ٹانگ ہی گئی نا لیکن سوچو تو کیا کیا ملا ہے مجھے؟۔ کیا کیا ملے گا مجھے؟۔ مجھے نوکری ملے گی۔ اُس نوکری سے مجھے میرے حصے کی روٹی ملے گی۔ صرف روٹی ہی نہیں بلکہ ساری خوشیاں ملیں گی مجھے۔ میری ہر آرزو پوری ہوگی، میری ہر تمنا پوری ہوگی اور تو اور میں ممتا کو بھی حاصل کر سکوں گا۔"

"ممتا......؟" اُس نے چونک کر وشال کی طرف دیکھا۔ آج پہلی بار اُس نے وشال سے اُس کی کسی واقف کا نام سُنا تھا۔ اُس نے پوچھا۔ "ممتا کون ہے۔؟"

"ممتا...... میری ممتا......؟" وہ اپنی آنکھوں میں زندگی کے خواب سجاتے ہوئے بولا۔ "جو کئی سالوں سے میری نوکری کے خواب دیکھتی رہی ہے۔ جو میری ہمراز، میری ہمقدم اور میری ہم نواہ ہے۔ جو کئی سالوں سے میرے لیے بیٹھی ہوئی ہے۔ جس کی میری روح نے آرزو کی ہے، تمنا کی ہے۔ جو میرے جیون کی ہر خوشی کا محور ہے۔ جس کے گرد میں

شاید کئی جنموں سے گھومتا رہا ہوں اُسی کو میں نے کئی سالوں سے میرے خوابوں میں میری دولہن بنی شرماتے دیکھا ہے۔ ممتا کسی تصور کا نام نہیں ہے بلکہ ایک اُس سچائی کا نام ہے جس کو اپنانے کے لیے ہی میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

اندر ہی اندر نیلما کو چھنا کے ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ اندر ہی اندر اُسے درد و کرب کی لہریں اُٹھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اندر ہی اندر اُسے اپنا وجود ڈولتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اُس کے سپنے ٹوٹ رہے تھے۔ شاید اسی وجہ سے اُس کے اندر چھنا کے ہو رہے تھے۔ درد و کرب کی لہریں اُٹھ رہی تھیں اور شاید اسی وجہ سے اُسے اپنا وجود ڈولتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"کیا سوچنے لگی؟" وشال نے بے خبری میں پوچھا۔

"ممتا کے بارے میں آج تک بتایا نہیں۔ اُس نے مایوس ہو کر پوچھا۔

"شاید کبھی موقعہ نہ ملا ہو۔ وہ نرمی سے بولا۔

"آج موقعہ ملا۔ وہ اپنے آنسوں روکتے ہوئے بولی۔ پہلے بھی تو بتا سکتے تھے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے۔"

"بہت فرق پڑتا تھا۔ پہلے بتاتے تو شاید میں......؟ وہ اپنی محبت کے بارے میں بتاتے بتاتے رک گئی۔ بولی۔ "شاید میں اُسے یہاں بلاتی۔

"کس لیے"۔

"تمہارا خیال رکھنے کے لیے۔"

"خیال تو تم لوگوں نے میرا کیا کم رکھا ہے؟۔"

"بہت پیار کرتے ہو ممتا سے کیا؟"

بہت تو بہت چھوٹا لفظ ہے نیلما۔ بہت زیادہ سے بھی زیادہ، تم کوئی معقول لفظ بتا دو۔

"بے انتہا اور......" وہ ٹوٹتے ہوئی بولی، اور والہانہ۔"

"ہاں بے انتہا اور والہانہ، لیکن تمہاری آنکھوں میں آنسوں کیوں ہیں؟۔"

"آنسوں......؟" وہ ہڑبڑا سی گئی۔ وہ اپنے آنسوں کی وجہ وشال کو نہ بتانا چاہتی تھی۔ سنبھل کے بولی۔ "ہاں" یہ تمہارے اور ممتا کے ملن کی خوشی کے آنسوں ہیں۔

"ملن......؟ وہ ایک آہ بھر کے بولا۔ ابھی ملن کہاں ہوا ہے۔"

''ہو جائے گا۔''

''امید تو ہے۔''

اُس کی بھیگی ہوئی پلکوں میں جانے کتنے سپنے سج گئے تھے اور نیلما کے دل کا ہر سپنا ٹوٹتا جارہا تھا۔ اندر ہی اندر اُسے چھبن سی محسوس ہو رہی تھی۔ ہوک سی اُٹھتی جارہی تھی۔ کئی دنوں سے اُس نے اپنے دل میں وشال کو اپنا جیون ساتھی بنانے کا سپنا سجایا ہوا تھا لیکن اس سپنے کو اس نے وشال پر ظاہر نہ ہونے دیا تھا۔ کیونکہ اُس نے سوچا تھا کہ جب وشال پوری طرح ٹھیک ہو جائے گا تب وہ اُسے سب کچھ بتا دے گی لیکن آج وشال نے ممتا کے بارے میں اُسے کہہ کر اُس کا ہر سپنا توڑ دیا تھا۔ اس نے آنکھیں اُٹھا کر وشال کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے سپنوں میں کھویا ہوا جانے کہاں پہنچ چکا تھا۔ شاید اپنی ممتا کے پاس۔

نیلما نے سوچا کہ وشال کے ساتھ محبت اُس نے بھی کی ہے اور ممتا نے بھی کی ہے۔ دونوں کے دلوں کی منزل وشال ہے لیکن یقیناً اس کی محبت سے زیادہ بڑی اور طاقتور ممتا کی محبت ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے وشال بے چین و بے قرار ہے اور اپنے ایک حد سے ناکارہ اور نالائق ہونے کے باوجود اُسے یقین ہے کہ ممتا اس کے انتظار میں بیٹھی ہو گی اور جب وہ گھر لوٹ جائے گا تب وہ اُسے اپنے سینے سے لگا کر قبول کرے گی۔ نیلما نے سوچا کہ اگر وشال کو ممتا کی محبت پر اتنا یقین ہے تو اس یقین کی کوئی وجہ بھی ضرور ہو گی اور وہ وجہ صرف اُن کی بے لوث اور والہانہ چاہت ہے۔ اُس نے سوچا کہ اپنی محبت کا اظہار کر کے اُسے وشال اور ممتا کی محبت کے درمیان نہیں آنا چاہیے کیونکہ وہ اُس کی زندگی کا سب سے بڑا گناہ ہو گا۔ اُس نے سوچا کہ اگر وہ وشال سے اپنی محبت کا اظہار کرے گی تو شاید اس کے احسانوں کے بوجھ میں وہ اس کی محبت کو ٹھکرانے کی ہمت نہ کرے گا لیکن ایسا کر کے وہ دو محبت بھرے دلوں کو جدا کرنے کا گناہ نہ کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ وشال کی محبت اپنے سینے میں لیے خاموشی سے جلتی رہے گی اور اگر اُس محبت کی آگ میں جل کر وہ راکھ بھی ہو جاتی ہے تب بھی وہ وشال اور ممتا کی محبت کے درمیان نہ آئے گی۔ وہ اپنی آنکھوں میں آنسوں لیے اپنے کمرے میں چل دی۔

دل بے چین کو سنبھالنے کے لیے صرف یہ سہارا تھا کہ شاید اتنی دیر میں ممتا نے اپنا گھر

بسالیا ہو۔!!

صُبح ہی صُبح نیلما پکنک پر جانے کا بہانہ کر کے وشال کو اپنے ساتھ کار میں بٹھا کر لے گئی۔ وشال اس کی برابری والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں خاموش تھے۔ نیلما کو دُکھ تھا کہ وشال کو پا کر بھی وہ اُسے پا نہ سکی اور یہ کہ وشال اس کی محبت سے بے خبر اُس سے دور جا رہا ہے۔ اس کے سینے میں بسی وشال کی محبت رو رہی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کی یک طرفہ محبت اُسے اندر ہی اندر ختم کر ڈالے گی اور عمر بھر وہ اُس محبت کی آگ میں جلتی رہے گی چاہئے کوئی اور آ کر اس پر اپنی محبت کی پوری برسات بھی کیوں نہ برسا دے؟۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود وہ وشال کو اپنی محبت کے بارے میں کچھ بھی نہ کہنا چاہتی تھی۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں وشال کو اُس کی محبت کے بارے میں پتہ چل گیا تو شاید وہ اُس کے احسانوں کے بدلے اپنی محبت کا تیاگ نہ کرے اور یوں وہ اپنی محبت نہ ہار جائے جس کو بیان کرنے کے لیے کل تک اس کے پاس الفاظ بھی نہ تھے۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" وشال نے پوچھا۔

"یہ کہ نوکری ملتے ہی تم یہاں سے چلے جاؤ گے لیکن تمہارے جانے کے بعد اس بات کی حسرت میرے دل میں ضرور رہے گی کہ تمہارے ساتھ اتنی دیر رہ کر بھی میں تمہارے بارے میں کچھ نہ جان سکی۔

"سب کچھ تو بتا چکا ہوں تمہیں۔ اب کیا جان لینا چاہتی ہو تم؟"۔

"وشال تمہیں اپنے حصے کی روٹی چاہئے تھی تا کہ تم ممتا کو حاصل کر سکو۔ تمہاری وہ روٹی تمہارے لیے ممتا کو حاصل کرنے کی ایک اجازت نامے کی طرح ہے۔ تم ممتا کو حاصل کر کے اس کے ساتھ وہ روٹی مل بانٹ کر کھانا چاہتے تھے اور وہ روٹی حاصل کرنے کے لیے تم نے جو کچھ بھی کیا اس سے تم نے پورے سماج کے چہرے پر ایک بھرپور طمانچہ مارا ہے لیکن تمہارا وہ طمانچہ صرف تم نے۔ میں نے اور بھیا نے دیکھا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تمہاری کہانی پوری دُنیا کو سُنائی جائے تا کہ سب کو پتہ چلے کہ ہم جس سماج میں رہ رہے ہیں اس کے ہاتھ کتنے ظالم اور بے رحم ہے اور اُس سماج میں ایک آدمی کو اپنا حق اور اپنے حصے کی روٹی حاصل کرنے کے لیے کیا کیا کرنا پڑتا ہے؟۔ میں چاہتی ہوں کہ تمہاری اس کرنی کو پوری

دُنیا کو پتہ چل جائے۔"

"یہ تو سب کو معلوم ہی ہے نیلما۔ کیونکہ ہر آدمی کے ساتھ کوئی نہ کوئی ایسی کہانی ضرور گزری ہے شاید تمہیں معلوم نہیں ہے نیلما کہ اس سماج نے ہر آدمی کے سینے میں چھوٹا بڑا ایک نہ ایک ناسور ضرور پیدا کیا ہوا ہے۔ اس لیے میری اس کہانی کو دُنیا والوں کے سامنے رکھنے سے کیا فائدہ ہوگا؟۔"

"میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ بہت بڑا انقلاب آئے گا اور یقین جانو کہ وہ انقلاب سب سے انوکھا ہوگا جو دُنیا نے پہلی بار دیکھا ہوگا۔ کم از کم اتنا تو ضرور ہوگا وشال کہ رشوت کے اس بے ہودہ رواج کے خلاف کہیں نہ کہیں سے کوئی نہ کوئی آواز ضرور اُٹھے گی اور شاید تمہیں معلوم نہیں کہ جب کسی ظلم کے خلاف آواز اٹھتی ہے تو اُس کی گونج دور دور تک جاتی ہے اور ظالموں کی پوری طاقت فنا ہو جاتی ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ کیا تم یہ نہیں چاہتے ہو کہ اس سماج میں ہر حقدار کو اُس کا حق ملے؟۔ کیا تم چاہتے ہو کہ آنے والے دنوں میں نوجوان اپنے اپنے حصے کی روٹی حاصل کرنے کے لیے تمہاری ہی طرح........؟۔"

"نہیں وہ تڑپ کر درمیان میں ہی بولا۔ میں ایسا کیسے چاہ سکتا ہوں؟۔"

"ہاں۔" نیلما فوراً بولی۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم نے اپنے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہے وہی تم اوروں کے ساتھ ہوتے نہیں دیکھنا چاہو گے کیونکہ اتنا کچھ کرنے کے بعد اگر تم کچھ حاصل بھی کرو گے تو تم بہت کچھ کھو بھی گئے ہو۔ اس لیے شروع سے آخر تک تم مجھے اپنی پوری کہانی سناؤ کیونکہ تمہاری کہانی صرف تمہاری کہانی نہیں ہے بلکہ ہر نوجوان کی کہانی ہے اور یہ کہانی دُنیا کو سُنانا ضروری بھی ہے۔"

"ہاں۔" وہ نیلما کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے بولا۔ تم یہ کہانی ضرور لکھو۔ شروع سے آخر تک لکھو۔ ہر بات لکھو۔ ہر حادثہ لکھو، ہر تجربہ لکھو، ہر غم، ہر رنج لکھو، لکھو کہ آرزوئیں کیسے تڑپتی ہیں؟ لکھو کہ سپنے کیسے ٹوٹ جاتے ہیں؟۔ لکھو کہ حق کیسے مارا جاتا ہے؟ لکھو کہ روٹی کیسے چھینی جاتی ہے؟ لکھو کہ لوگوں کے رہنما کیسے وعدے کرتے ہیں اور کیسے اُن وعدوں کو توڑ دیتے ہیں؟ لکھو کہ ایک عام آدمی کو توڑنے کے لیے وہ رہنما کیسی

سازشیں رچاتے ہیں؟۔ ہر بات لکھوتا کہ ایک ایسا انقلاب آجائے جس میں وہ جل کر راکھ ہو جائیں جو لوگوں کے حق چھین کر بازار میں بیچ دیتے ہیں۔" اس کی آواز بھر آئی تھی۔ شاید اُس کے اندر اُس کی روح رو رہی تھی۔ کچھ دیر تک وہ سر جھکائے کچھ سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

"یہ کہانی ہر آدمی کی کہانی ہے نیلما اور ہر آدمی کی کہانی کی طرح میری اس کہانی میں بھی غم تو ہے ہی کہیں خوشی بھی ہے۔ یہ کہانی اصل میں تب سے شروع ہوتی ہے جب میں نے کالج میں داخلہ لیتا تھا۔ اُس سے پہلے اسکول میں ممتا اور نوین دونوں میرے ساتھ پڑھتے تھے اور چونکہ ہم تینوں ایک ہی بستی کے تھے اس لیے ہمارے درمیان زیادہ دوریاں نہ تھیں۔ کالج میں آتے آتے ہم شاید زندگی کے اُس مقام پر آ پہنچے تھے جہاں ہم اپنے آپ کو اور ایک دوسرے کو پہچان لینے کے قابل ہو گئے تھے۔ ممتا کالج میں آتے آتے اپنے پورے جوبن میں آگئی تھی۔ ویسے بھی اُس پر سولویں بہار آ گئی تھی اور آتے جاتے وہ اپنی سبھی بہاروں کی خوشبوئیں بکھیرتی سب کو دیوانہ بنائے جا رہی تھی۔ چڑھتا شباب اوس کی بوند ایسا خوبصورت اور نازک تھا۔ جوبن کا جواب نہ تھا۔ آنکھوں میں سے بچپن نکل کر مستی بھر آئی تھی جیسے آنکھیں نہ ہوں بلکہ مدہوش کر دینے والی سوم رس کی دو کٹوریاں ہوں جن کو پینے کے لیے شرابی تو شرابی نہ پینے والا بھی شرابی ہو جائے۔ اُس حُسن کو بیان کرنا کسی کے لیے بھی نا ممکن تھا کیونکہ اتنے سارے حُسن کو بیان کرنے کے لیے شاید کسی بھی زبان میں الفاظ کافی نہیں ہیں۔ مختصر وہ شاہکار تھی یا کوئی خوبصورت غزل یا پھر بیان نہ ہو سکنے والی کوئی پُرکشش داستان۔ وہ بے قصور تھی کہ وہ حسین تھی۔ آخر بہار اگر خوشبوئیں بکھیرتا ہے تو اس میں بہار کا کیا گناہ؟۔ ایسے ہی ممتا کے جسم کے پھول بھی مہک رہے تھے۔ تو اس میں اُس کا کیا قصور تھا اور اس کا تو شاید اس میں بھی کوئی قصور نہ تھا کہ اُس کے من مندر میں وشال کی مورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے من مندر میں کسی اور مورت کا کیا کسی سائے کا گزر بھی ممکن نہ تھا۔ وہ کیا کرتی؟ بس میں کچھ نہیں تھا۔ مجبور تھی دل کے عقیدوں کو بدلنا نا ممکن ہوتا ہے۔ کوئی اس کے دل کے عقیدے کو کیسے بدلتا؟ وہ بھی کیسے بدلتی؟۔ آخر دل پر کب کسی کا زور چلتا ہے؟ دل تو دل ہے۔ پھسل گیا جو پھسل گیا، بانہوں کے سہارے ہی اُسے کھڑا کر سکتے ہیں۔

محبت جوان تھی اور اُس جوان محبت کے راستے بھی بہت خوبصورت تھے۔ اُن

راستوں پر پھول ہی پھول تھے۔ مہک ہی مہک تھی۔ کوئی کانٹا، کوئی چبھن، کوئی خراش نہ تھی گویا قدرت نے کانٹے نکال کر کلیاں اُن کے راستوں میں بکھیر دی ہوں۔ دونوں کے دلوں میں ہی بات تھی کہ جب محبت کے راستے ہی اتنے خوبصورت ہیں تو اس کی منزل تو اور بھی زیادہ خوبصورت ہوگی۔ کالج میں آتے ہی وشال نے ہر دل میں اپنے لیے عزت پیدا کر دی تھی۔ کیونکہ وہ پڑھائی میں اچھا تھا۔ اپنے خلوص اور اصولوں سے بھی وہ ہر دل کا تارا تھا۔ وہ بہت اچھا کھلاڑی بھی تھا۔ علاوہ بڑوں کی عزت کرنا بھی اس کی فطرت میں تھا۔ کالج میں اس کی عزت تو تھی ہی کالج سے باہر کی دنیا میں بھی سب اس کی عزت کرتے تھے۔ کیونکہ وہ سب سے پیار کرتا تھا اور ہر ایک کے دُکھ سُکھ میں شامل ہونے کو تیار رہتا تھا۔ بستی میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جس کی اُس نے کسی نہ کسی طرح مدد نہ کی ہو۔ رادھا چاچی اور اس کی بیٹی شیلا کے گھر میں کوئی مرد نہ تھا تو شیلا سے اپنی کلائی پر راکھی کے تار بندھوا کر وہ اس کا بھائی بنا اور ہر دن اُن کی خبر لینا وہ اپنا دھرم مانتا تھا۔ بستی میں ہی کیدار ناتھ ایک وہ آدمی تھا جس پر فالج گری ہوئی تھی اور جس کا پوری دنیا میں اس کی بیوی کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ کیدار ناتھ کی خبر لیتے رہنا اور اس کی مدد کرتے رہنا بھی وشال اپنا فرض مانتا تھا۔ اصل میں اس سے کسی کے دُکھ نہ دیکھے جاتے تھے اور وہ چاہتا تھا کہ یہ دُنیا ایک ایسی جگہ بن جائے۔ جہاں ہر آدمی کو سُکھ نصیب ہوں۔ ہر آدمی عزت سے زندہ رہے، عزت سے کمائے اور عزت سے کھائے۔

بستی کا ہر آدمی اُسے دُعائیں دیتے نہ تھکتا تھا اور اُس کے ماں باپ بھی اس کے طور طریقے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ اولاد ہونہار ہو، عزت والی ہو، ماں باپ کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی ہے اور اپنے ماں باپ کی یہ خواہش اُس نے اپنی کم سنی میں ہی پوری کر دی تھی۔ بڑا بھائی کندن سرکاری نوکر ہو گیا تو سب کو بڑی خوشی ہوگئی۔ گھر کی آمدنی بڑھ جانے سے زندگی کا معیار اور بھی ٹھیک ہو جانے کی اب بہت گنجایش تھی لیکن جلد ہی کندن نوکری کے سلسلے میں دوسرے شہر چل دیا تو گھر میں وشال کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئیں لیکن اُن ذمہ داریوں کو بھی اُس نے اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیا اور اپنی فطرت کے مطابق ہر کام کرتا گیا۔ اس میں ممتا بھی برابر اُس کا حوصلہ بڑھاتی گئی۔ ماں باپ تو اُس سے

خوش ہی تھے لیکن وہ اُس کی پڑھائی کے لیے بھی فکر مند تھے۔

''بیٹے''۔اس کے باپ نے اُسے سمجھایا۔تم یہ سب جو کرتے ہو مجھے اس پر بہت خوشی ہے۔تم نے دور دور تک ہماری عزت بنائی ہے لیکن بیٹے میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی پڑھائی کی طرف بھی دھیان دو۔''

''پڑھائی تو ہو ہی رہی ہے پتا جی''۔

''تمہاری پڑھائی بہت ضروری ہے بیٹے کیونکہ پڑھائی سے ہی تمہیں تمہاری روٹی ملنی ہے۔''

''یہ تو آپ مجھے میرے بچپن سے کہتے آئے ہیں۔''

''آج پھر کہہ رہا ہوں۔دیکھ میرے پاس کچھ ایسا تو نہیں ہے کہ کل کو تمہارے لیے کوئی کاروبار بٹھا سکوں اس لیے تمہاری پڑھائی بہت ضروری ہے۔تم اس بارے میں ذرا بھی لاپرواہ نہ ہو جانا۔دیکھو تمہارا بڑا بھائی کندن سرکاری نوکر ہو گیا۔عمر بھر کی روٹی ملی اُسے۔

''جی''۔

''اب مجھے اس کی کوئی پریشانی نہیں ہے کہ کیونکہ وہ کماؤ ہو گیا۔میں نے تو تعلیم دلوا کر اُسے اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ خود اپنا بُرا بھلا سوچ سکتا ہے۔اب جب کہ اُسے نوکری مل گئی ہے تو وہ اپنا گزر راہ کر لے گا۔اب مجھے صرف تمہاری فکر لگی رہے گی اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی پڑھائی کی طرف دھیان دو۔پڑھائی کے بعد کوئی نوکری حاصل کر کے اپنے حصے کی روٹی حاصل کر لو اور میں تمہارا گھر بسا لوں تب ہی مجھے چین ملے گا۔

''آپ فکر نہ کریں پتا جی۔''وہ پورے اطمینان سے بولا۔''میں پڑھائی میں آپ کو کبھی نا اُمید نہ کروں گا۔''

''مجھے تم سے یہی اُمید ہے بیٹے۔تم نے آج تک بھی پڑھائی میں مجھے کبھی نا اُمید نہیں کیا ہے اور ہاں بیٹے تم اوم پرکاش کی بیٹی رجنی کو تو ٹھیک سے جانتے ہو نا؟''

''جی''۔

''کیسی لڑکی ہے وہ۔؟''

''بہت اچھی ہے لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''۔

''اُسے تمہاری بھابھی بنا دیں تو......؟''۔

''میری طرف سے کوئی انکار نہیں ہے پتا جی باقی آپ دیکھ لو اور بھیا سے بھی پوچھ لو''۔

اوم پرکاش ٹھیک عزت دار اور کھاتے پیتے تھے۔ رجنی بھی شکل وصورت اور اُٹھنے بیٹھنے میں ٹھیک تھی۔ ماں نے اس بارے میں کندن سے بات کی۔ کندن کو بھی رجنی کے ساتھ شادی کرنے میں کوئی حرج نہ تھا۔ پہلے بات چیت ہوئی۔ دونوں طرف سے جلد ہی ہاں ہو گئی۔ منگنی ہو گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے رجنی گھر کی بہو بن کر گھر میں چلی آئی۔ سب خوش تھے۔ رجنی بہت خوش اخلاق تھی۔ وشال کی وہ بہت عزت کرتی تھی اور اُس سے زیادہ عزت وہ اپنے ساس سُسر کی کرتی تھی اور وہ بھی اُس کے ناز نخرے اُٹھاتے تھکتے نہ تھے۔ گھر میں بہت اچھی رونق آ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے رجنی کے آنے سے گھر میں بہار چلی آئی ہو لیکن رجنی کے بارے میں سب کی جو رائے تھی چند ہی دنوں میں وہ غلط ثابت ہوئی۔ اُس کی خوش اخلاقی جانے کہاں چلی گئی۔ وہ سب کی عزت کرنا بھی بھول گئی اور کسی نہ کسی بہانے کسی سے بھی وہ لڑنے کو تیار رہنے لگی۔ دراصل گھر گرہستی اُس سے سنبھالی نہ جاتی تھی۔ وشال نے ہر معاملے پر غور کیا تو اُسے لگا کہ اگر رجنی کا اس سب میں قصور ہے تو قصور اس کی ماں کا بھی ہے۔ دراصل ماں جب تک صرف ماں ہوتی ہے تب تک بیٹے کے جوان ہو جانے کو بہت ترستی رہتی ہے۔ بیٹے کے جوان ہو جانے پر وہ بہو کے آنے کو ترستی رہتی ہے لیکن جب بہو گھر میں چلی آتی ہے تب وہ ایک دم گھر کی پوری ذمہ داری بہو پر چھوڑ دیتی ہے۔ یہ بھی نہیں سوچتی ہے کہ اُس کی بہو بھی کسی کی لاڈلی بیٹی ہے اور یہ کہ وہ اس کے بیٹے کی عمر کی ہے یا پھر کچھ سال اُس سے کم عمر کی ہے۔ بیٹے میں تو اُسے بچپنا اور کم سنی نظر آتی ہے لیکن بہو میں وہ ایسا کچھ بھی نہیں دیکھ پاتی ہے۔ یہاں تک کہ چوکا چولہا بھی پوری طرح اُسی کو سنبھالنے کے لیے دیتی ہے۔ یہ بھی نہیں سوچتی ہے کہ صرف کل تک اُس کی بہو اپنے ماں باپ کے گھر میں راج کرتی رہی ہوگی۔ وشال نے اس بارے میں ماں سے بات کی تو ماں کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اُس نے فوراً ہی چوکا چولہا پھر سے سنبھالا۔ رجنی کو بھی سنبھالنے اور سمجھانے

کے اُس نے جتن کیے لیکن وہ تب تک بگڑ ہی گئی تھی۔ سنبھل نہ سکی۔ وشال نے مجبور ہو کر اس بارے میں اپنے باپ سے بات کی تو وہ اُداس ہو کر بولے۔

''سب اُس کی تعریف کرتے تھے اور تم بھی......؟''

''میں اُسے بچپن سے جانتا ہوں پتا جی۔ وہ بہت اچھی لڑکی لگتی تھی مجھے یا پھر مجھے ہی پہچاننے میں غلطی ہو گئی۔

''یہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ میں نے بھی جب اُسے دیکھا تھا تب مجھے وہ ستی ساوتری ایسی لگی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ میرے گھر کو سنبھالے گی۔ کندن کو سنبھالے گی، تمہارا خیال رکھے گی۔ بوڑھاپے میں میرا اور اپنی ساس کا سہارا بنے گی لیکن......؟ وہ ایک آہ بھر کے بولے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ مجھے معلوم ہے کہ ہر گھر میں بہو آ کر لڑ ہی لیتی ہے لیکن ہم نے پورا گھر ہی اس کے حوالے کر دیا تھا تا کہ وہ اس کو اپنا گھر جان کر جیسے چاہیے چلائے لیکن یہ بھی نہ ہو سکا۔ وہ اسکو گھر کو اپنا گھر جان ہی نہ سکی۔ ہر گھر میں بہو کو لڑنے میں تھوڑی دیر تو لگتی ہے لیکن تمہاری بھابھی کو زیادہ دیر بھی نہ لگی۔ وہ تو آتے ہی بگڑ گئی۔

''بگڑی ہوئی ہر بہو کو سنبھالنے کی کوشش تو کی جاتی ہے پتا جی''

''تم نے کوئی کوشش کی؟''

''ہاں''

''میں نے بھی کی، تمہاری ماں نے بھی کی لیکن وہ خود کو سنبھالنا چاہے تب ہی وہ سنبھالی جا سکتی ہے''

پھر کیا کیا جائے پتا جی؟''

''کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے''

''آپ تو بالکل ہی نا امید ہوئے لگتے ہیں پتا جی۔ میں ایک رائے دے دوں؟''

''دے دو۔ شاید تمہاری ہی رائے کارآمد ثابت ہو''

''میری رائے کہ بھابھی کو بھیا کے پاس روانہ کیا جائے''

''اس سے کیا فائدہ ہوگا؟''

''بہت فائدہ ہوگا پتا جی، پھر اس میں نقصان بھی کیا ہے؟ پتا جی۔ وہ اس گھر کی بہو

ضرور ہے لیکن اس سے پہلے وہ بھیا کی بیوی ہے۔ شاید وہ یہی چاہتی ہو کہ اسے بھیا کے پاس بھیجا جائے۔ اس کے جانے سے یہ فائدہ بھی ہوگا پتاجی کہ اس گھر میں کوئی ہنگامہ نہ ہوگا۔ دوسرا فائدہ یہ کہ وہاں اسکے پاس لڑنے کے لیے کوئی موجود نہ ہوگا۔ وہ لڑنا بھی چاہے تو کس کے ساتھ لڑے گی اور ہم سے دور رہ کر شاید اس کے دل میں ہمارا پیار بھی بڑھ جائے۔"

"لیکن اُس نے تو کبھی ایسا اشارہ نہ دیا۔"

"وہ نہ بھی دے ایسا اشارہ تو کیا ہے؟ اگر وہ ہم سے نہیں سنبھلتی ہے تو بھیا کے اوپر یہ ذمہ داری ڈال دو۔

"تم شاید ٹھیک کہتے ہو۔"

رجنی کندن کے پاس چل دی تو گھر میں ذرا سی شانتی ہوگئی لیکن شاید شانتی وشال کے نصیب میں تھی ہی نہیں۔ جلد ہی باپ کی اچانک موت نے اسے یتیم بنا ڈالا۔ کندن فوراً ہی رجنی کے ساتھ چلا آیا اور کچھ دنوں میں واپس چل دیا۔ لیکن جانے سے پہلے وہ وشال سے اتنا بھی نہ کہہ سکا کہ اُسے کچھ چاہئے تو نہیں یا گھر میں یہ چیز یا وہ چیز ہے کہ نہیں؟ فرض جان کر ہی کہتا تب بھی بہت تھا۔ وشال سے نہ کہتا، ماں سے ہی کہتا تب بھی بہت تھا۔ اُس نے ماں سے بھی ایسا کچھ نہ کہا تھا گویا باپ کی موت پر محض دُنیا داری اور دکھاوے کی خانہ پوری کے لیے آیا تھا۔ وشال کو بہت دُکھ ہوا۔ ماں کو بھی اس بات کا بہت دُکھ ہوا۔ وشال کی آنکھوں میں بس وہ منظر تھا جب اس کے باپ کا آخری وقت آیا تھا۔ اُس وقت انہوں نے وشال کو اپنے سے دور نہ جانے دیا تھا۔ بولے تھے۔

"موت میرے سامنے ہے بیٹے لیکن موت کے بعد بھی مجھے تمہاری فکر رہے گی۔

"آپ کو کچھ نہیں ہوگا پتاجی۔"

"میرا...... میرا آخری وقت آگیا ہے بیٹے۔ مرنے سے پہلے میں تمہیں کماؤ دیکھنا چاہتا تھا لیکن ایسا...... ایسا اب ممکن نہیں ہے۔ اُن کی سانس پھول رہی تھی۔

"میں کماؤ ہو جاؤں گا پتاجی، ضرور ہو جاؤں گا۔"

"ہاں مجھے یقین ہے۔" وہ کھانسنے لگے۔ کھانسی کا دورہ لمبا ہوتا گیا۔ اُن کی

آنکھیں پھٹ کر باہر نکلنے لگیں۔ کسی طرح خود کو سنبھال کے بولے۔ ''اپنی...... ماں کا ......خیال رکھنا۔''

''پتا جی......''

''سب کے ساتھ اچھا کرنا......'' دمہ اُن کو بولنے کی اجازت نہ دے رہا تھا'' اپنے بھائی سے...... نہ لڑنا کسی بھی طرح...... اُسکی من مانی...... سہہ لینا۔ وہ...... وہ تمہیں ستائے گا لیکن...... لیکن اپنے باپ...... کی عزت...... کا خیال رکھنا۔ گھر کی بات...... اوروں کو...... نہ سُنانا'' وہ چپ ہو گئے۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جیسے اپنے لخت جگر کو دیر تک دیکھنا چاہتے ہوں۔ لیکن وشال اپنی آنکھوں میں پڑے ہوئے آنکھوں کے جالوں میں بھی ان کی موت دیکھ چکا تھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر ان کی آنکھوں پر ان کے پلکوں کے پردے گرا دیئے تو اس کی ماں بھی سب کچھ سمجھ گئی۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ وشال نے ماں کو بھی سنبھالا اور کندن کو بھی اطلاع کی۔ کندن آیا تو وشال کی بھی ہمت بندھ گئی لیکن پھر کندن کے اچانک اور چپ چاپ جانے سے اس کی ہمت ہی ٹوٹ گئی۔ اس نے خود کو تو کسی نہ کسی طرح سنبھال ہی لیا لیکن ماں نہ سنبھل پا رہی تھی۔ وشال کو اب اس کی تشویش تھی۔ بولا۔

''ماں۔ اگر تم پتا جی کی موت کے غم میں رو رہی ہو تو مجھے کوئی دُکھ نہیں ہے۔ لیکن اگر تم بڑے بھیا کے اِس طرح چُپ چاپ جانے کے غم میں رو رہی ہو تو ماں میں سمجھوں گا کہ تم مجھے اس لائق نہیں مانتی ہو کہ میں تمہاری سیوا کر سکوں۔

''نہ...... نہ بیٹے۔'' ماں اُسے اپنے آنچل میں چھپا کر۔ بولی۔ ''تم ہی تو میرا سہارا ہو، میرے لعل ہو، اب میں نہ روؤں گی۔ دیکھ، میں نے آنسوں پونچھ لیے۔'' اُس نے واقعی اپنے آنسوں پونچھ لیے۔

''دوبارہ ان کو اپنی آنکھوں میں نہ آنے دینا ماں۔''

''تم خود تو رو رہے ہو بیٹے۔''

میں کہاں رو رہا ہوں ماں۔'' وہ زبردستی اپنے آنکھوں میں آنسوں روک کر بولا۔'' دیکھ میری آنکھیں خشک ہیں۔''

''من سے رو رہے ہو تم۔''

''من کو سمجھاتے کچھ دیر تو لگے ہی ماں۔'' وہ تیزی سے ماں سے نکل گیا کیونکہ اُس کی آنکھوں میں آنسوں آنے کو مچل رہے تھے اور وہ ماں کے سامنے آنسوں نہ بہانا چاہتا تھا تا کہ اُسے تکلیف نہ ہو۔

وشال کے کاندھوں پر اب گھر اور ماں کی ذمہ داری آ گئی۔ کندن نے بھی کبھی مُڑ کے نہ دیکھا۔ دیکھتا بھی کیسے؟ گھر والی نے لگام جو کس کر رکھی تھی۔ وشال کے پاس اب باپ کی پنشن کا ہی ایک سہارا بھا۔ زندگی بھر کی بچت تو انہوں نے کندن کی شادی اور اُس کی شادی سے پہلے گھر کی مرمت میں لگا دی تھی۔ باپ کے پنشن کی معمولی سی رقم سے دو آدمیوں کے پیٹ کی آگ کیسے بجھائی جا سکتی تھی؟۔ وشال نے کسی جگہ کوئی چھوٹی موٹی سی نوکری کرنے کی بات سوچی اور یہی بات اُس نے ممتا سے کہی تو وہ چپ ہو کر کچھ سوچنے لگی۔

''کیا سوچنے لگی؟'' وشال نے پوچھا۔

''تمہاری نوکری کے بارے میں۔''

''کیا ہوا؟''۔

''ابھی تمہاری پڑھائی بھی پوری نہیں ہوئی اور......؟''۔

''لیکن اس کے سوا چارہ کیا ہے؟''۔

''مجھے معلوم ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔'' وہ ڈبڈباتی آنکھوں سے بولی''۔ لیکن وشال تم ابھی سے نوکری کرنا شروع کرو گے تو مجھے بھی پڑھائی چھوڑنا پڑے گی۔''

''کیوں......؟''

''کیونکہ......'' وہ اپنی نظریں جھکا کے بولی۔ میں تم سے زیادہ پڑھ چکی تو میرے گھر والے ہمارا ملن نہ ہونے دیں گے۔''

وشال نے بہت ہی پیار سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسوں دیکھ کر وہ اُس پر جیسے قربان ہوتے ہوئے بولا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہمارے درمیان صرف دوستی نہیں پیار بھی ہے۔''

''اب پتہ چلا ہے۔ وہ شکوہ کرتے ہوئے رو پڑی۔''

" پتہ تو پہلے بھی چلا تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر اس بارے میں تم سے کچھ نہ کہا تھا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ یہ کام تم خود کرو۔ اب جب کہ تم سب کچھ کہہ ہی چکی ہو تو میں تم سے ایک بات کہوں؟۔"

" کیا......؟"

" مجھے آنسوؤں سے نفرت ہے اس لیے حالات جیسے بھی ہوں، میرے سامنے کبھی آنسوں نہ بہانا۔"

" کبھی بے خودی میں نکل گئے تو......؟"۔

" خود کو سمجھانا اور نکلے ہوئے آنسوں کی اپنی پلکوں میں جذب کر لینا۔"

" لیکن ان کے بہنے سے تو جی ہلکا ہو جاتا ہے۔"

" ہاں شاید آنسوں بہانے والے کا جی ہلکا ہوتا ہو گا لیکن سامنے والے کو یہ توڑ دیتے ہیں۔ تم نے آنسوں بہائے تو میرے تو سارے حوصلے ٹوٹ جائیں گے۔

" تم بہادر ہو۔ اپنے حوصلوں کو ٹوٹ جانے نہ دو۔

" میں کوشش کروں گا۔"

" تم بہت بہادر ہو۔ سب کہتے ہیں۔ ماں اور ڈیڈی بھی کہتے ہیں۔"

" تم کیا کہتی ہو۔"

" یہ کہ تم بہت اچھے ہو، وہ شرما گئی۔"

" اور اگر میں نوکری کرنے لگوں تو......؟۔"

'تب بھی تم اچھے ہی رہو گے بلکہ میری نظروں میں تمہاری اور بھی عزت بڑھ جائے گی کہ تم ہارے نہیں۔ لڑ گئے تم۔ مقابلہ کیا تم نے اِن اَن چاہی اور بے وقتی مصیبتوں کا جو تقدیر نے تمہارے سامنے کھڑی کر دیں لیکن......؟۔"

" اُمید اور یقین میں لیکن کا لفظ شامل نہیں کرتے ہیں ممتا۔ وہ فوراً بولا۔ ہماری زندگیوں کے دوران اس لیکن اگر، مگر وغیرہ کو میں آتے نہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہاں میں جانتا ہوں کہ زندگی کے اس مقام پر میں پڑھائی سے ہٹ کر کوئی دوسرا کام کرنے لگا تو میں بچھڑ جاؤں گا اور میرے ساتھی میرے سے آگے نکل جائیں گے لیکن ممتا میں ایک ماں کام

بیٹا بھی ہوں اور میری ماں کی بھوک مٹانا میرا پہلا فرض، میرا پہلا دھرم ہے۔ مجھے اپنا فرض نبھانے دو ممتا۔ ہماری شادی تو پھر دور کی بات ہے، پہلے روٹی کا انتظام تو ہو۔ وہ تیزی سے وہاں سے چل دیا تو ممتا اُسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اُسے وشال کے لیے بہت دُکھ ہو رہا تھا۔ وشال سے اُس نے محبت کی تھی لیکن وشال کے سامنے جو حالات آ گئے تھے اُن سے وہ بہت ڈر رہی تھی کیونکہ وہ ایک اُس خاندان سے تھی جو تعلیمی لحاظ سے پورے علاقے میں مشہور تھا۔ جہاں آدمی کی پڑھائی ہی آدمی کی پرکھ مانی جاتی تھی۔ اُس کے پتا شام سُندر پروفیسر تھے اور اپنی قابلیت سے دور دور تک مشہور تھے۔ ماں بھی اچھی خاصی پڑھی لکھی تھی۔ خاندان کا ہر فرد پڑھا لکھا تھا۔ ہر بیٹی پڑھی لکھی تھی، ہر بہو پڑھی لکھی تھی اور ہر جمائی پڑھا لکھا تھا۔ ممتا بھی پڑھائی کر رہی تھی۔ ممتا نے محبت کی تھی۔ وشال کے ساتھ پیار کیا تھا جو بستی کے ہر آدمی کی آنکھوں کا تارا تھا یہاں تک کہ ممتا کے ماں باپ بھی وشال کی بہت عزت کرتے تھے لیکن حالات نے جس طرح وشال کی پھلتی پھولتی زندگی کو اپنے آہنی پنجوں میں جکڑ لیا تھا اُس سے وہ بہت گھبرا رہی تھی۔ وشال کی تعلیم مکمل نہ ہوئی تو اُس صورت میں ممتا کو ڈر تھا کہ اُس کے ماں باپ اُس کی شادی وشال کے ساتھ کرانے میں راضی نہ ہوں گے۔ وہ بہت ہی نا اُمید اور اُداس ہو گئی لیکن وہ وشال پر زیادہ دباؤ بھی نہ ڈال سکتی تھی کیونکہ وشال نے سچ ہی کہا تھا کہ وہ ایک ماں کا بیٹا بھی ہے جس کی بھوک مٹانا اُس کا پہلا فرض، پہلا دھرم ہے اور وہ اپنا فرض اور دھرم اُسے نبھانا ہی تھا بھلے ہی ممتا کے سپنے ٹوٹ بھی کیوں نہ جائیں؟۔ واقعی سپنوں سے زیادہ قیمتی آدمی کی روٹی ہوتی ہے۔ اگلے دن وہ اپنی اُداسی لے کر کالج پہنچی تو وہاں وشال کو موجود پا کر اُسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ وشال مسکراتے ہوئے اُس کے پاس آیا۔ بولا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟۔ مجھے یہاں دیکھ کر حیران ہو گیا؟۔

”ہاں۔ تم تو کہہ رہے تھے کہ تم......؟۔

”کہ میں ایک ماں کا بیٹا ہوں“ وہ فوراً بولا۔ وہ تو میں ہوں ہی اور وہ فرض تو میں نبھا ہی لوں گا۔

”پھر......؟“

"میں نے سوچا کہ میں ایک ممتا کا وشال بھی ہوں۔"

"تھ...... تھ۔ تھینکس Thanks۔ اُس کی آنکھوں میں آنسوں بھر آئے تو وشال بولا۔

"رونا نہیں ممتا۔ تم تو میرے حوصلے توڑ دو گی۔

"نہ...... نہ۔" وہ فوراً اپنے آنسوں خشک کر کے بولی۔ میں نہیں روؤں گی۔

"بہت بہادر ہو تم۔"

"کیسے بہادر سمجھا تم نے مجھے۔"

"اس لیے کہ تم نے کل مجھے پڑھائی چھوڑنے سے روکا نہیں بلکہ اپنی نظروں میں میری عزت یہ سوچ کر اور بڑھائی کہ میں ہارا نہیں ہوں بلکہ مقابلہ کیا ہے میں نے اُن مصیبتوں کا جو تقدیر نے میرے سامنے کھڑی کر دی ہیں۔"

"سچ ہے یہ۔"

"لیکن ایک سچ یہ بھی کہ ایسا کر کے میں تم کو ہارنے جا رہا تھا۔"

"یہ تم سے کس نے کہا۔"

"کسی نے نہیں لیکن تمہارے گھر میں بڑائی کا جو چلن ہے وہ مجھے کہاں قبول کرتا"

"تم نے سوچا تو ٹھیک تھا لیکن شاید ممتا کی محبت پر یقین نہیں ہے تمہیں۔"

"یقین ہے ممتا یقین ہے لیکن میں ان پڑھ رہتا تو مُشکل تو ضرور پیش آتی۔ تم کوئی بڑی افسر ہوتی اور میں ایک معمولی سا ان پڑھ آدمی۔ ہمارے ملن میں دیواریں پیدا ہوتیں اور جب ہم وہ دیوارایں گرا دیتے یا اُن کو پھاند کر نکل جاتے تب لوگ ہمارے ملن پر مذاق اڑاتے۔ بہر حال ممتا۔ تم مجھے کچھ ٹیوشن دلوا سکتی ہو تو اچھا۔"

"تم مجھے پڑھاؤ۔ غم کے ماحول سے نکلنے کے لیے اُس نے مذاق کا سُہارا لیا۔

"تمہیں۔" تمہیں کیا پڑھاؤں۔

"تم مجھے پیار کا سبق پڑھاؤ۔

"فیس کیا دو گی؟"

"اپنا...... وہ گردن جُھکا کر بولی۔ اپنا پورا وجود۔

''وشال کا جی اُس پر قربان ہونے کو چاہا۔ بولا۔ ''پڑھائی میں تم تیز تو ہو ہی، پیار میں بھی تم بہت آگے نکل گئی ہو۔

''آخر شاگرد کس کی ہوں؟''۔

''میری...... اس میں کیا شک ہے کہ اُستاد بھی کسی سے کم نہیں ہے۔

''اب زیادہ شیخی نہ جھاڑو۔ میں تمہارے لیے ٹیوشن کا انتظام کرلوں گی۔''

ممتا نے اِدھر اُدھر سے اُسے کچھ ٹیوشن دِلوائے۔ کچھ اُس نے خود بھی اِدھر اُدھر تلاش کیے۔ ٹیوشن کے ساتھ ساتھ اُس نے اپنی تعلیم بھی جاری رکھی تب اُسے لگا کہ وہ اپنے اور ممتا کے سپنے کو شاید پورا کر سکے گا۔ بستی میں چند ایک بچے ایسے بھی تھے کہ جن کے ماں باپ پیسے دے کر بچوں کو ٹیوشن دینے کی حالت میں نہ تھے۔ چنانچہ وشال نے اپنے دوست روی اور بستی کے کچھ اور نوجوانوں کو اپنے ساتھ ملا کر ایسے بچوں کو اپنے فالتو وقت میں مفت پڑھانے کا کام شروع کیا۔ اس کام سے بستی کے ایک مشہور سماج سیوک موہن بابو ایسے مُتاثر ہوئے کہ انہوں نے فوراً ہی وشال کو اپنے پاس بلا کر بستی کی ترقی اور سُدھار کے اور بھی کئی کام شروع کروائیے۔ ہمت پا کر وشال نے موہن بابو کی مدد سے چندہ جمع کر کے غریب بچوں کو سرکاری اسکول میں داخلہ دلوایا۔ بستی کے لوگ پہلے ہی وشال کی عزت کرتے تھے۔ ان کاموں سے بستی کے لوگوں میں وشال کی اور زیادہ عزت بڑھ گئی تب پہلی بار وشال کا ہم کلاس گپتا جی کا بیٹا نوین اُس کے مقابلے میں اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اپنی خاندانی شان کے ساتھ بولا۔

''چندہ جمع کر رہے ہو کیا؟''۔

''ہاں۔''تم سے بھی لینا ہے چندہ۔ کچھ بچے......؟''۔

''ہاں''نوین درمیان میں ہی بولا۔ بچوں کو اسکول میں داخلہ دلوانے کے بہانے چندہ لوگوں سے جمع کر کے تم اپنا گزارہ بھی چلا رہے ہو۔

وشال نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ اس سارے پیسے کا حساب دینا ہوگا تمہیں۔

وشال کو یہ بہت بُرا لگا لیکن پھر بھی وہ نرمی سے بولا۔ لوگوں کا پیسہ لوگوں کے کام ہی

آئے گا۔تم بے فکر رہو۔

''اور تمہارے گھر میں آٹا دال آسمان سے ٹپک کر آتا رہے گا کیا؟''۔

''شٹ اپ'' وشال غصے میں بولا۔تمہارا مطلب ہے کہ لوگوں کے پیسے سے میرا آٹا دال آتا ہے۔

''ہاں۔یہی مطلب ہے میرا اور میں تم سے پائی پائی کا حساب لوں گا۔

''حساب تم جب چاہو لے لینا لیکن پہلے اپنے دل سے پوچھو کہ اس سب کا حساب لینا تمہارا حق بنتا ہے کیا؟۔تم نے اتنے بڑے باپ کے بیٹے ہونے کے باوجود اس چندے کی رقم میں ایک پیسہ بھی نہ دیا ہے اور ہاں تم سب کو اپنا جیسا نہ سمجھو۔شاید کبھی ایسا بھی وقت آ جائے کہ جب تمہارے گھر کی آمدنی اور تمہارے گھر میں رکھی ہوئی کاروں کا تم سے حساب مانگا جائے گا۔وہ وہاں سے تیزی سے چلنے لگا لیکن پھر رُک کے بولا۔ہاں۔تم مجھ سے حساب لینا چاہتے ہو تو کبھی بھی چلے آنا۔حساب مل جائے گا۔وہ تیزی سے وہاں سے چل دیا اور یہی بات اُس نے جا کر موہن بابو سے کہہ دی۔وہ بولے۔

''تم نے جو راستہ اپنایا ہے بیٹے اِس میں بہت پھسلن ہے لیکن پھسلن کے ڈر سے لوگ ہمالیہ پر چڑھنے اور اُسے فتح کرنے کا ارادہ نہیں چھوڑتے ہیں۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بابو جی۔وشال بولا۔لیکن آپ جانتے ہیں کہ میرے پتا جی کی ایمانداری کی قسمیں لوگ اُس کی موت کے بعد بھی کھاتے رہے ہیں اور میں اُن کے نام پر کوئی دھبہ نہیں لگانا چاہتا ہوں۔

''میں بھی تمہارے پتا جی کو جانتا ہوں۔اُن کی ایمانداری کی مجھے بھی قدر ہے۔مجھے تم پر بھی پورا بھروسہ ہے۔صرف بھروسہ ہی نہیں بلکہ پورا یقین ہے۔ایمانداری تمہارے خون میں ہے۔تمہاری رگ رگ میں ہے۔''

''لیکن نوین کی بات مجھے بہت بُری لگی ہے۔''

''وہ ایک بڑے باپ کی بگڑی ہوئی اولاد ہے۔اُس کی باتوں سے ڈر کر تم ہمت نہ ہارو۔اپنا کرم کرتے جاؤ۔لوگ سب کچھ جانتے ہیں۔سچ اور جھوٹ کی اُن کو پوری پہچان ہے۔

پوری بستی میں پہلے سے ہی موہن بابو کی بہت عزت تھی۔ نوجوان نسل کو اپنے ساتھ ملا کر سُدھار کے کام شروع کرتے ہی اُن کے چرچے اور بھی آس پاس کی بستیوں میں عام ہوئے اور دوسری بستیوں سے بھی اُن کو ایسے ہی سُدھار والے کام کرنے میں مدد اور مشوروں کے بُلاوے آ گئے۔ موہن بابو کو جہاں سے بُلاوا آیا وہ وہاں نکل گئے اور اس سلسلے میں وہ جہاں بھی گئے وشال کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ وشال کی وہ بہت عزت کرتے تھے۔ بستی میں غریب بچوں کو مُفت میں پڑھانے کا کام وشال نے شروع کیا تھا تو موہن بابو نے وشال کو اپنے ساتھ ملا کر گلی کوچوں کی صفائی، سڑکوں کی عارضی مرمت اور بجلی وغیرہ کا انتظام بھی کرایا۔ موہن بابو کی مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی اور علاقے کے ایم۔ ایل۔ اے گپتا جی اُن کی مقبولیت سے خوف کھاتے جا رہے تھے۔ اس لیے اُن کا لاڑلا بیٹا نوین موہن بابو اور وشال کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو کم کرنے کی کوشش میں تھا۔ بستی کے لوگ موہن بالو اور وشال کے کام سے بہت خوش تھے اور ہر کوئی دونوں کی عزت کرتا تھا۔ یہ سب دیکھ کر ممتا خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ وشال کی عزت اُس کی اپنی عزت تھی اور وشال بھی اُسے اپنے سے الگ نہ مانتا تھا۔ وشال کی عزت اور مقبولیت سے سب خوش تھے لیکن نوین اندر ہی اندر جل رہا تھا۔ اُس کا باپ چونکہ علاقے کا ایم۔ ایل۔ اے تھا اس لیے وہ باپ بیٹا دونوں ہی نہیں چاہتے تھے کہ اُن کے علاقے میں کوئی ایسا آدمی پیدا ہو جو لوگوں کے دلوں میں گھر بنا لے اور بعد میں اُن کے خلاف ایک طاقت بن کر کھڑا ہو جائے اس لیے علاقے بھر میں اپنا اثر و رسوخ برقرار رکھنے کے لیے وہ موہن بابو اور وشال کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔

پوری بستی میں میں رادھا چاچی ہی ایک ایسی عورت تھی جس کی کوئی آمدنی نہ تھی اور جس کے اوپر اُس کی جوان بیٹی شیلا کی شادی کا بوجھ بھی تھا۔ شیلا ایک بہت ہی اچھی لڑکی ثابت ہوئی تھی اور محنت کر کے وہ اپنا اور اپنی ماں کا پیٹ پالتی تھی۔ کِسی کے آگے اُس نے کبھی ہاتھ نہ پھیلائے تھے اور نہ ہی اُس نے کبھی کِسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا تھا۔ درندے تو چاروں پہر مُنہ کھولے ہضم کر جانے کے لیے موقع کی تلاش میں تھے لیکن شیلا نے بہت سنبھلتے ہوئے چل کر اپنا دامن داغدار ہونے سے بچائے رکھا تھا۔ وشال اُس کو اپنی بہن کی طرح مانتا تھا اسلئے اُس کی شادی کو بھی وہ اپنی ذمہ داری مانتا تھا۔ یہی

بات اُس نے ایک بار موہن بابو کو سنادی تو وہ بولے۔

"شاباش بیٹے۔ اگر تمہارے دل میں ایسے خیالات ہیں تو مجھے یقین ہے کہ تم زندگی میں کامیاب رہو گے ایسا کرنا تو بہت بڑا دھرم ہے۔"

"لیکن یہ کام ہوگا کیسے؟"

"تم شیلا اور اُسکی ماں کی رضامندی لے کر شیلا کے لئے کوئی اچھا سا لڑکا دیکھو۔ باقی کی ذمہ داری میری رہی۔"

شیلا میں کوئی کمی نہ تھی سوائے اِس کے کہ وہ یتیم تھی، بے سہارا اور غریب تھی لیکن اُس غریبی میں بھی وہ بارہ کلاس پڑھی تھی۔ پوری بستی میں وہ اپنے خلوص اور شرافت کے لیے مشہور تھی۔ آج تک اُس پر کسی نے انگلی بھی نہ اُٹھائی تھی۔ ہنر مند بھی وہ تھی اور شکل و صورت میں بھی وہ اچھی تھی۔ وشال کی ذرا سی ہی کوششوں سے ایک اچھا نوجوان گوپال شیلا کے ساتھ شادی کرنے کے لیے راضی ہو گیا۔ موہن بابو نے فوراً ہی بات طے کر لی اور شادی کی تاریخ بھی مقرر کر لی۔ اتنی بڑی بات بستی والوں نے پہلی بار دیکھی اور سنی تھی اِسلئے ہر کوئی موہن بابو اور وشال کے گُن گانے لگا۔ ہر جگہ اُن کے چرچے ہونے لگے۔ سب کی یہی رائے تھی کہ اگر موہن بابو اور وشال کی یہ جوڑی ایسے ہی کام کرتی رہی تو وہ دن دور نہیں ہے کہ جب پوری بستی میں ہی نہیں بلکہ علاقے بھر میں سُکھ ہی سُکھ ہوگا۔ لوگ اُن کو دیوتا اور فرشتہ کہنے لگے۔ کئی لوگوں نے وشال سے مِل کر اُس کا حوصلہ بڑھایا۔ اُن میں ممتا کے پِتا پروفیسر شام سُندر بھی تھے۔ انہوں نے بڑے ہی فخر سے اور بڑی ہی خوشی سے وشال کے شانے تھپتھپاتے ہوئے اُسے کہا۔

"Well done my boy۔ تمہاری جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔"

"Thank you sir۔"

"تم اِن کاموں میں ظاہر ہے کہ بہت مصروف رہتے ہوں گے اِسلئے اگر تمہاری پڑھائی میں اِس سے کوئی کمی رہ جاتی ہے تو میں تمہاری کوچنگ Coaching کے لیے بالکل تیار ہوں۔"

"Thanks sir۔ اگر کبھی ضرورت ہوئی تو میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

''بغیر جھجک چلے آنا۔ مجھے خوشی ہوگی۔''

وشال اور موہن بابو کی اتنی زیادہ بڑھتی ہوئی مقبولیت دیکھ کر گپتا جی اور نوین بوکھلا گئے چنانچہ انہوں نے فوراً ہی ایک سیاسی چال چلی تو گوپال نے وشال کے سامنے شیلا کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا۔

''کیوں، ایسی کیا بات ہوئی؟'' وشال نے فوراً پوچھا۔ ''ابھی کچھ دن پہلے ہی ہم سب نے مل کر تم دونوں کی شادی کی تاریخ بھی پکی کر لی ہے۔ اچانک یہ کیا ہو گیا کہ تم شادی سے انکار کر رہے ہو۔؟''

وہ کچھ نہ کہہ سکا تو وشال نے پوچھا۔ ''شیلا غریب گھر کی ہے کیا اس لیے شادی سے انکار کر رہے ہو؟''

''نہیں۔ لیکن میں یہ شادی نہیں کر سکتا ہوں۔''

''دیکھو گوپال۔'' وہ اُسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''تم نے شیلا کے ساتھ شادی کرنے کر فیصلہ اپنی مرضی سے کیا تھا۔ کسی نے تم پر اپنی مرضی نہ ٹھونس لی تھی۔ ہم بھی بڑے فخر سے اس شادی کی تیاریوں میں لگے ہیں اور اس سے شادی کے چرچے بہت دور دور تک ہوئے ہیں۔ تم اب اس شادی سے انکار کرو گے تو شیلا دور دور تک بدنام ہو جائے گی۔ کوئی اُس کے ساتھ شادی کرنے کے لیے آگے نہ آئے گا۔ اس لیے تم میری مان لو، اس شادی سے انکار نہ کرو۔''

''میں اس کے لیے بہت مجبور ہوں وشال۔'' وہ وہاں سے تیزی سے نکل گیا تو وشال بہت پریشان ہو گیا۔ اُس نے فوراً ہی جا کر یہ بات موہن بابو کو بتا دی کہ اُن کو بھی بہت تشویش ہو گئی۔ وہ فوراً ہی وشال کو ساتھ لے کر گوپال کے ماں باپ سے ملے جہاں گوپال کے ماں باپ سے اُن کو پتہ چلا کہ گوپال کو اس شادی سے انکار کرنے کے لیے گپتا جی نے مجبور کیا ہوا ہے۔ وشال نے موہن بابو کی طرف دیکھا وہ بولے۔

''اس میں اس طرح حیران ہونے کی کوئی بات نہیں ہے وشال۔ ایسا ہر جگہ ہوتا ہے کیونکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو خود تو کچھ نہیں کرتے ہے اوروں کو بھی کچھ نہ کرنے دیتے ہیں۔''

''لیکن کیوں؟۔''

''یہی سیاست ہے اور یہی سیاست دانوں کے کھیل ہیں اور بھارت کی سیاست میں ایسے ہی لوگ بہت دور نکل جاتے ہیں جونہیں چاہتے ہیں کہ کوئی دوسرا کوئی اچھا کام کرکے لوگوں کا پیار حاصل کرسکے۔''

''لیکن یہ تو ناانصافی ہے۔''

''انصاف کہاں ہے؟۔'' وہ فوراً بولا۔ مجھے اُس کی تلاش ہے۔''

''عدالت میں۔''

''اُس عدالت میں جس نے آج تک ایک بھی دہشت پسند کو پھانسی کی سزا نہ دی۔''

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''۔

''وہی جو سچ ہے۔ چھوٹے چھوٹے جرموں کے مجرم بے شک سزا پاتے ہیں لیکن بڑے مجرم......؟ صاف نکل جاتے ہیں۔''

''مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔''

''عمر چھوٹی ہے تمہاری اس لیے یہ بات انہونی سی لگتی ہے۔ تم نے رنگا اور بھلا زو مجرموں کا نام سُنا ہوگا۔

''جی...... جی ہاں۔''

''پھانسی چڑھ گئے وہ کیونکہ انہوں نے جُرم کیے تھے لیکن وہ دہشت پسند جو ان گنت قتل کرتے ہیں، اُن قتلوں کا اقبال بھی کرتے ہیں، پھانسی کیوں نہیں چڑھائے جاتے ہیں۔ جب تک یہ بھید بھاؤ ہے تب تک تم انصاف کی اُمید نہ کرسکتے ہو۔'' بہرحال ہمیں اس وقت شیلا کی شادی کی فکر کرنی چاہئے۔ ابھی گوپال کے انکار کو ہمیں راز میں رکھنا ہوگا۔''

گوپال پر دباؤ ڈالا گیا تھا کہ وہ شیلا کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کرلے اس لیے وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ دراصل گپتا جی نے پوری بستی میں اپنا ایسا دباؤ پیدا کیا ہوا تھا کہ کوئی اُن کے خلاف آواز اُٹھانے کی ہمت نہ کرتا تھا حالانکہ بہت سے لوگ ایسے ضرور تھے جو اُن کے خلاف بولنا چاہتے تھے لیکن خوف اور ڈر نے سب کی زبانوں پر تالے چڑھائے ہوئے تھے۔ گوپال بھی خوفزدہ ہوا تھا لیکن وشال اور موہن بابو نے دھیرے دھیرے اُس کا حوصلہ

بڑھا کر اُسے گپتا جی کے خوف سے باہر نکالا تو اُس نے شیلا کے ساتھ شادی کرنے کے لیے پھر سے ہاں کر دی۔ وشال کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی لیکن گپتا جی اور نوین نے اس کو اپنی بے عزتی سمجھ لیا۔ اس لیے شادی سے صرف دو دن پہلے انہوں نے گوپال کو چوری کے الزام میں گرفتار کروا لیا۔ پوری بستی میں جیسے ماتم ہو گیا۔ چوک میں برگد کے پیڑ کے نیچے تقریباً سبھی بستی والے جمع ہو گئے۔ موہن بابو اُن سے بولے۔

"ہم سب کو معلوم ہے کہ گوپال بے گناہ ہے اور اُسے ایک خاص مقصد کے لیے پھنسایا گیا ہے۔ لیکن ہم اِس زیادتی کے خلاف آواز اُٹھالیں گے۔ آپ لوگ یہ جان لیں کہ ہم گوپال کو رہائی دلوا کر ہی رہیں گے۔ اس لیے آپ لوگوں میں سے ہماری آواز کے ساتھ آواز ملانے والے جتنے بھی لوگ ہیں وہ اپنے ہاتھ اُٹھائیں۔

پورے ہجوم میں صرف دو ہاتھ اُٹھے۔ ایک وشال کا ایک ممتا کا۔ باقی خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے رہے۔ بوڑھے برگد کا پیڑ بھی خاموش تھا۔ لگا اُسے شرم آ رہی ہے۔ ان گنت سالوں سے لوگ اُس بوڑھے برگد کی چھاؤں میں بیٹھ کر مل کر محلے کے اور بستی کے فیصلے کرتے آ رہے تھے۔ آج بھی لوگ فیصلہ کرنے کے لیے ہی جمع ہو گئے تھے اور آج کا فیصلہ بہت اہم تھا لیکن آج کوئی بولتا نہیں ہے۔ جیسے کہ جسموں سے خون کی ایک ایک بوند نکالی گئی ہے۔ برگد شرمندگی سے خاموش تھا۔ اُس کی خاموشی سے ممتا شرمندہ تھی، وشال شرمندہ تھا۔ وشال جوان تھا، جوان خون جوش کھا گیا وہ زور سے بولا۔

"بابو جی۔ آپ جن لوگوں سے ہاتھ اُٹھانے کو کہہ رہے ہیں وہ بچارے تو اُن چوہوں کی طرح ہیں جن کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون ڈالے گا؟ یہ لوگ تو شروع سے ہی اپنے اندر یہ غم پالے ہوئے ہیں کہ بلی ان کو کھا جائے گی۔ چوہوں سے بھی گئے گزرے اور بدتر ہیں یہ لوگ۔ پھر وہ لوگوں کی طرف مُڑ کے بولا۔" اور آپ سب سُن لو۔ آج اس بستی میں یہ پہلی شادی رُکی ہے۔ کل اور شادیاں بھی رُک جائیں گی۔ اس لیے بزدلوں کی طرح نظریں جھکا کر ہر ایک ظلم، ہر ایک ستم نہ سہو۔ ہم آزاد بھارت واسی ہیں۔ ہم اب غلام نہیں ہیں کہ کوئی رائے بہادر یا دریا خان بہادر انگریز سپاہی لے کر بستی کی بستی تباہ کر دے گا۔ آزاد دیش کے آزاد لوگوں کو کوئی بھی ظلم نہ سہنا چاہئے۔

کیونکہ یہ دیش ہمارا ہے اور اس کی سرکار ہی ہماری ہے۔ کوئی بدیسی ہماری سرکاری کرسیوں پر نہیں بیٹھے ہیں۔ ہم ایک ظلم کو خاموشی سے سہہ لیتے ہیں تو اگلے اور ظلم کرنے کے حوصلے پاتے ہیں۔ بہت ہو گیا اب۔ بہت ظلم سہہ لیے ہم نے۔ اب خاموش رہ کر اُن کے حوصلے اور نہ بڑھاؤ۔ ارے آپ کے گھروں تک، آپ کی عزت تک پہنچ گئے ہیں یہ لیڈر۔ اب جاگنے کا وقت آیا ہے ایک ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ آج اگر ہم ایک نہ ہوئے تو کل کسی بھی غریب کی بیٹی کی شادی نہ ہوگی اور اگر ہو بھی گئی تو اُن کی مرضی سے ہوگی۔ رام بابو۔ وہ بستی کے ایک بزرگ کے سامنے کھڑا ہو کے بولا۔ ''کیا آپ اپنی بیٹی کی شادی کسی اور کی مرضی سے کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے؟۔

''ہرگز نہیں۔''

''تو پھر آج کیوں چپ ہیں آپ؟ کیا شیلا آپ کی بیٹی کے برابر نہیں ہے۔؟''

''برابر......؟ تمہارا اس برابری سے کیا مطلب ہے؟'' رام بابو بولے ''شیلا میری بیٹی ہے۔ بستی کی ہر بچی میری بیٹی ہے۔

''تو پھر کچھ کیوں نہیں بولتے ہیں آپ؟'' کیا اس لیے کہ آپ کے دل میں کسی کا خوف ہے؟۔''

''تھا'' ...... رام لعل بولے۔ خوف تھا لیکن جس محلے میں تمہارا جیسا ایک نوجوان موجود ہو اُس محلے میں کسی کو کسی سے خوف کھانے کی کیا ضرورت ہے؟۔'' تم نے ہماری آنکھیں کھولی ہیں۔ اب ہم کسی سے بھی نہ ڈریں گے بلکہ ایک ہو کر اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائیں گے۔ لڑیں گے۔

رام بابو کی باتوں کا بستی والوں پر اتنا اثر ہوا کہ پوری بستی ایک ہو کر موہن بابو کی رہنمائی میں گوپال کو چھڑانے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ وشال بھی اُن کے ساتھ تھا۔ وشال کے سبھی دوست بھی اُن کے ساتھ تھے۔ بستی کا ہر آدمی اُن کے ساتھ تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وشال کے سمجھانے پر شیلا بھی گوپال کو بے گناہ سمجھنے لگی تھی اور وہ بھی گوپال کی رہائی کے لیے آگے نکل آئی تھی۔ اُس سے حوصلہ پا کر دیگر عورتیں بھی گوپال کی رہائی کی مانگ کرنے کے لیے گھروں سے باہر نکل آئیں۔ معاملہ دور دور تک نکل گیا۔ پولیس بھی

اس معاملے پر سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور ہوگئی۔ موہن بابو کا بھی دور دور تک اثر و رسوخ تھا۔ آج تک انہوں نے کبھی نہ ہی سیاست میں دلچسپی لی تھی اور نہ ہی کبھی پولیس کے چکروں میں پڑ گئے تھے۔ آج وہ پہلی بار کسی آدمی کو پولیس کے چکروں سے چھڑانے کے لیے میدان میں آئے تھے۔ اس لیے فوری تحقیقات شروع ہوگئی۔ سیاسی طور اگرچہ گپتاجی بہت اہمیت تھی تو سماجی طور پر موہن بابو بھی کسی سے کم نہ تھے اور اس معاملے میں لوگوں کی یکجہتی دیکھ کر گپتاجی زیادہ ٹکر نہ لے سکے اس لیے وہ ایک اور سیاسی چال چلے۔ وہ خود ہی گوپال کی چھڑا کر لے آئے۔ شاید انہوں نے سوچا ہوگا کہ اُن کا سواگت کر کے اُن کی جے جے کار کی جائے گی لیکن سب کو معلوم تھا کہ گوپال کی رہائی بستی والوں کی یکجہتی سے ہی ممکن ہوگی ہے۔ گپتاجی اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔ بہر حال شادی کی مہورت میں ابھی کچھ وقت باقی تھا اس لیے شادی اپنے مقررہ وقت پر ہوگئی۔ اس شادی میں نہ صرف بستی کے نوجوان ہی ناچے بلکہ انہوں نے اپنے ناچ گانے میں موہن بابو اور وشال کو بھی شامل کیا۔ یہ ساری خوشیاں صرف شیلا کی شادی کی نہ تھیں بلکہ بستی کے لوگوں کے اتحاد کی کامیابی کی بھی تھیں۔ چوک کا بوڑھا برگداب بالکل شرمندہ نہ تھا۔ لگا وہ بہت زیادہ خوش ہے شاید اس وجہ سے وہ اپنی شاخوں اور پتوں میں حرکت کر کے ٹھنڈی ہوائیں بکھیرتا جا رہا تھا ۔ممتا نے وشال کے کان میں کہا۔"

"بہت خوشی کی بات ہے، ہے نا؟"۔

"ہاں تو"

"جب تمہاری شادی ہوگی تب بھی ایسے ہی ناچو گے کیا؟"۔

وشال نے بڑے پیار سے اُس کی طرف دیکھا۔ بولا۔ "اُس دن تو میں اپنی دولہن کو ساتھ لے کر ناچوں گا۔"

"نا بابا نا"۔ وہ فوراً بولی۔ میں نہ ناچوں گی۔"

"میں تم کو نچانے کی بات کب کر رہا ہوں۔ میں تو اپنی دولہن کو نچانے کی بات کہہ رہا ہوں"۔

"تم...... تم کیا سوچتے ہو میں کسی اور کو تمہاری دولہن بننے دوں گی؟"۔

تم بنو گی میری دولہن ؟"۔

"ہاں"

پھر تو تمہیں ناچنا ہی ہو گا۔"

"یہ کون سی شرط ہوئی۔"

"یہی میری شرط ہے۔ اُس نے ممتا کی کلائی تھام لی اور اُسے ناچنے والوں کی ٹولی میں پہنچا دیا۔ خوب ہنگامہ رہا۔ تھوڑی دیر میں وہ ناچنے والوں سے جان چھڑا کر پھر سے وشال کے پاس پہنچی۔ پھولتی سانسوں میں بولی۔

"ہو گی نا شرط پوری ؟"۔

وشال نے پیار سے اُس کی طرف دیکھا۔ پھر بولا۔ "جانتی ہو ناچتے ہوئے تم کیسی لگ رہی تھی۔"

"کیسی"۔

"مورنی جیسی"، جی چاہتا ہے کہ تم ہمیشہ ناچتی گاتی رہو اور میں تمہیں دیکھتا رہوں

"میں ہمیشہ ناچتی گاتی رہی تو پھر ہم شادی کب کریں گے۔ ممتا نے مذاق کیا۔"

"شادی...... ممتا میں پڑھائی ختم کر کے کماؤ ہو گیا ہوتا تو شاید آج ہی تمہیں بیاہ لیتا مگر ایسا نہیں ہے کچھ سال انتظار کرنا پڑے گا اور پھر ہم شادی کر کے ایک ہو جائیں گے۔ یہی ہمارا سپنا ہے نا ؟"۔

"سپنا"۔ وہ فوراً ہی جانے کہاں کھو گئی۔ شاید سپنوں کی وادیوں میں جہاں پھول تھے یا گنگا تھی۔ خوبصورتی تھی اور مہک تھی۔ وشال اُسے چھوڑ کر آگے نکل گیا کیونکہ وہ اتنے سارے لوگوں میں اپنی محبت کو رُسوا نہ کرنا چاہتا تھا۔ پھول نازک ہوتے ہیں، گنگا نرمل ،خوبصورتی خوبصورت اور مہک مہکی ہوئی ہے۔ سب کا ایک تقدس ہے اور ملے جلے اُس تقدس کو وہ رُسوا نہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ محبت اُسے اپنی روح سے بھی پیاری تھی اور اس کا تقدس وہ ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ وہ گلیوں میں اور سڑکوں پر اپنی محبت کے چرچے نہ کروانا چاہتا تھا۔ اگلے دن موہن بابو اُسے بولے۔

"جانتے ہو کہ گپتا جی گوپال کو کیوں پھانس لینا چاہتے تھے؟"

''ہاں اس لیے کہ اُن کے منع کرنے کے باوجود وہ شیلا کے ساتھ شادی کرنے کے لیے راضی ہو گیا تھا۔''

تم ٹھیک سمجھے ہو لیکن گوپال کو گرفتار کروا کر وہ بستی والوں سے یہ بھی کہنا چاہتے تھے کہ شیلا کی غریبی اور مجبوری کا فائدہ اُٹھا کر ہم اُس کی شادی ایک ایسے آدمی سے کروانا چاہتے تھے جو قانون کا مجرم ہے اور یہ کہ ایسا کر کے ہم نہ صرف شیلا کی زندگی کے ساتھ کھیل رہے تھے بلکہ اپنا بھی کوئی مقصد پورا کرنا چاہتے تھے۔ گوپال کو پھانس کر وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ہم قانون کے مجرموں کو نہ صرف پناہ دیتے ہیں بلکہ اُن کے گھر بھی بساتے ہیں۔

" Oh my God "

''ہاں۔ اس لیے تمہیں آج سے گپتا جی سے ہوشیار رہنا پڑے گا۔''

''آپ کو بھی''۔

''میں تو ہوشیار ہی ہوں لیکن مجھے تمہاری فکر لگی رہے گی۔ تم کالج میں بھی نوین کے مُنہ نہ لگنا۔

''میں کوشش کروں گا جی۔''

کالج میں بھی وشال اور نوین کے درمیان کچھ کھچاؤ سا رہا لیکن وشال نے اُسے زیادہ اہمیت نہ دی کیونکہ اُس کے لیے کالج کا مطلب صرف تعلیم حاصل کرنے کا ایک ٹھکانہ تھا اور وہ وہاں کسی کے منہ لگ کر اپنی تعلیم میں کوئی حرج پیدا نہ کرنا چاہتا تھا۔ احتیاطاً اُس نے ممتا کو بھی نوین سے ہوشیار رہنے کے لیے کہدیا تھا۔ اُسے اپنی فکر نہ تھی کیونکہ وہ نوین سے نہ خوف کھاتا تھا لیکن ممتا کے لیے اُسے ضرور تشویش تھی۔ عورت تو موم ہے، کنواری لڑکی موم سے بھی نازک۔ الزام کی ذراسی بھی آنچ برداشت نہیں کر پاتی ہے۔ بدنامی کی آگ کیسے سہہ سکتی ہے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا لیکن چند ایک دن بعد جب وشال کالج پہنچا تو پھاٹک پر ہی ممتا اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ممتا کی بھری ہوئی آنکھیں اور چہرے کی گھبراہٹ دیکھ کر وشال جان گیا کہ نوین کوئی بدصورت کھیل کھیل چکا ہے۔''

کیا بات ہے ممتا؟۔'' ''اُس نے اطمینان سے پوچھا۔ تم پھاٹک پر کیا کر رہی ہو۔

''میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔''

''لیکن اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو اور تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں؟''۔

''میں جانتی ہوں۔'' وہ بڑی مشکل سے اپنے آنسوں روکتے ہوئی بولی ''میں جانتی ہوں کہ تم بے قصور ہو لیکن اس وقت تم گھر جاؤ۔ وہ لوگ بہت غُصے میں ہیں۔

''کون سے لوگ غُصے میں ہیں؟ کیا بات ہوئی ہے۔''

''میں کیا بتاؤں، لیکن وہ ہے نا انجلی ماتھُر اپنے کلاس کی......؟''

''ہاں'' کیا ہوا اُسے؟''

''اُسے تمہارا خط ملا ہے۔''

''میرا خط ملا ہے؟ اُس نے حیرت سے پوچھا۔''

''ہاں وہ یہی کہتی ہے کہ اُسے تمہارا خط ملا ہے اور اُسے دیکھو، تم سے بات کرنے کے بدلے اُس نے وہ خط سب کو دِکھایا ہے۔ وہ یہاں کے پولیس کمشنر کی بیٹی ہے، سب اُسے مانتے ہیں اس لیے لڑکے غصے میں ہیں اور لڑکیاں اُن سے بھی زیادہ غُصے میں ہیں۔ پورا اسٹاف اور پرنسپل صاحب بھی ناراض ہیں تم سے اور نوین سب کو ہوا دے رہا ہے۔ وہ تم کو دفتر میں بُلائیں گے۔ تم کو سزا دیں گے۔ شاید کالج سے ہی نکال دیں۔'' آنسوں اُس کی آنکھوں سے بے تحاشہ گرتے گئے۔ بولی۔ ''لیکن پرنسپل صاحب تک پہنچنے سے پہلے نوین اور اُس کے دوست......؟ انجلی پولیس کمشنر کی بیٹی ہے۔ نوین یہاں کے ایم۔ ایل۔ اے کا بیٹا ہے۔ دونوں اچھے دوست ہیں اور تم نوین کے سب سے بڑے دشمن ہو۔ وہ اِس موقعے کا فائدہ اُٹھا کر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ موقعہ ملا ہے نا اُسے تمہیں نیچا دکھانے کا؟ وہ موقعہ پرست ہے، چالباز ہے، علاوہ تمہارا دشمن ہے۔ وہ یہ موقعہ ہرگز نہ چوکے گا اس لیے تم یہاں سے اپنے گھر لوٹ جاؤ۔

دھیرے سے ہاتھ اُٹھا کر اُس نے اپنی انگلیوں میں ممتا کے آنسوں سمیٹ لیے۔ بولا۔ ''پہلی بار زندگی میں آج تم کو ہاتھ لگا کر چھوا ہے اور وہ بھی تمہاری آنکھوں کے آنسوں سمیٹ لینے کے لیے۔ تم جانتی ہو کہ مجھے آنسوں سے بہت نفرت ہے کیونکہ یہ آنسوں آدمی کی بزدلی کا اعلان کرتے ہیں لیکن ہاں تمہارے یہ آنسوں اِس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ تم یہ نہیں مانتی ہو کہ وہ خط میں نے لِکھا ہے۔

''ہاں''

''مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی اور تم نہ ڈرو۔ سچ تو پھول کی طرح کِھلتا ہے، آج بھی کِھلے گا۔

''لیکن وہ لوگ......؟

''ممتا۔ تم تو کہتی تھی کہ میں بہادر ہوں۔''

''میں اب بھی کہتی ہوں۔''

''تو پھر بزدلوں کی طرح مجھے گھر لوٹ جانے کا مشورہ کیوں دے رہی ہو؟ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ ممتا بھی اُس کے ساتھ چلنے لگی۔ چلتے ہوئے وہ ممتا سے بولا۔ میں گھر لوٹ جاؤں گا تو وہ لوگ یہ مان جائیں گے کہ وہ خط میں نے لکھا ہے اور پھر اُن کے جی میں جو آئے وہ سزا مجھے دیں گے لیکن میں کیوں سزا اُٹھاؤں؟ میں نے تو کوئی جرم کیا ہی نہیں ہے''

تھوڑی دیر میں روی بھی اُن کے ساتھ ہولیا۔ وشال نے بغیر رُکے پوچھا۔ تم کیوں آ رہے ہو میرے ساتھ؟''

''تم مجھے سچائی کا ساتھ دینے سے روک نہیں سکتے ہو، میں جانتا ہوں کہ وہ خط تم نے نہیں لکھا ہے۔

''کیسے......؟''۔

تمہاری ممتا کے ساتھ محبت کی حد جانتا ہوں میں۔ تم کسی اور کے پیار کے طلب گار نہیں ہو سکتے ہو؟''

''پھر کس نے لکھا وہ خط۔''

''تم جانتے ہو کہ نوین کے سوا کوئی دوسرا ایسا کر ہی نہیں سکتا ہے۔''

نوین نے اپنے باپ کی ناجائز دولت کے سہارے دوست بنائے تھے لیکن وشال نے اپنے خلوص سے لوگوں کے دل جیت لیے تھے اور خلوص سے جیتے ہوئے لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ خلوص سے جیتے ہوئے وشال کے سارے دوست ایک ایک کر کے اُس کے ساتھ ہوتے گئے۔ اُن کو وشال پر بھروسہ تھا اس لیے وہ وشال کی حفاظت کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھے۔ سامنے نوین اپنی ٹولی کے ساتھ کھڑا تھا لیکن وشال کی ٹولی کی لمبائی اور

چوڑائی دیکھ کر اُس نے اپنی ٹولی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وشال اپنی ٹولی کے ساتھ چلتا رہا۔ پرنسپل کے دفتر کے پاس پہنچ کر اُس نے اپنے ساتھیوں کو رُک جانے کا اشارہ کیا اور پھر وہ اکیلا ہی Carridor سے چلتا ہوا پرنسپل کے دفتر میں داخل ہوا جہاں انجلی ماتھر پہلے سے ہی موجود تھی۔ وہ بولا۔

''معاف کیجئے گا سر۔ میں آپ کے بُلانے سے پہلے ہی حاضر ہوا ہوں۔''

''تم جانتے ہو کہ تم پر کتنا بڑا الزام ہے؟''۔

''سر میں جان گیا ہوں لیکن سر ابھی یہ صرف الزام ہے اور اس معاملے میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اور مجھے مجرم قرار دے کر سزا سُنانے سے پہلے میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ میری صفائی بھی سُن لیں گے۔

''ضرور۔''

''تو سر۔ میں مس انجلی ماتھر سے کچھ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

''کہہ دو، جو کہنا ہے۔

''انجلی۔'' وہ انجلی کا نام لے کر انجلی کی طرف مُڑا۔ کچھ دیر تک وہ اُس آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُسے یوں دیکھتا رہا کہ وہ سہم سی گئی۔ پرنسپل کی موجودگی میں ایسا ہوتے اُسے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ وشال دھیرے دھیرے اُس کے قریب ہوتا گیا۔ لگا وہ ابھی اُسے بانہوں میں بھرے گا۔ صرف سانسوں کا فاصلہ رہ گیا تھا پھر وہ ایک دم اُس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

''آئی۔ لو۔ یو۔"I Love You"

''شیٹ اپ'' وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔''

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟ پرنسپل بھی دہاڑے۔''

''سر'' وہ پرنسپل کی طرف مُڑ کر بولا۔ اسی بے ہودگی میں میری بے گناہی کا ثبوت ہے۔ مجھے مِس انجلی ماتھر کے نام چوروں کی طرف خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی سر کیونکہ میں اگر آپ کی موجودگی میں اُسے اتنی بڑی بات کہہ سکتا ہوں تو کسی جگہ تنہائی میں بھی کہہ سکتا تھا سر، آپ مِس انجلی ماتھر سے پوچھیئے کہ کیا کبھی اُن کو یہ بھی محسوس ہوا ہے کہ میں اُن سے کوئی

ایسی بات کہنا چاہتا ہوں؟ کیا میں کبھی اِن کے راستے میں کھڑا بھی ہوا ہوں؟ سر۔ یہ میرے Notes ہیں" وہ اپنی نوٹ بک پرنسپل کے سامنے رکھ کر بولا۔ "میری لکھائی کے ساتھ اس خط کی لکھائی ملائیے گا۔ اگر آپ کو لکھائی سے بھی لگتا ہے کہ وہ خط میں نے لکھا ہے تو بے شک آپ جو چاہئیں سزا مجھے دیں، مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔"

پرنسپل اُس کی صفائی سُن کر ہی سمجھ گئے تھے کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ وہ بولے۔ "اس سے پہلے کہ میں کسی نتیجے پر پہنچ جاؤں میں مس انجلی ماتھر سے اُس کی رائے پوچھنا چاہتا ہوں۔

"I am sorry Sir" ۔ وہ نظریں جھکا کر بولی۔ "دراصل وہ خط پا کر مجھے کوئی ہوش ہی نہ رہی تھی۔ مجھے یہ ہوش بھی نہ رہی کہ وشال اس کالج کی آنکھوں کا تارا ہے۔ اِس نے آج تک کسی کے ساتھ بُرا نہیں کیا ہے۔ کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کے بھی نہ دیکھا ہے۔ مجھے سوچنا چاہئے تھے کہ کیا یہ کر بھی سکتا ہے ایسا؟"۔

"یعنی تم مانتی ہو کہ یہ سب وشال نے نہیں لکھا ہے۔"

"یہ میں اب سمجھی ہوں سر اور میری یہ حالت ہے کہ وشال سے سوری Sorry بھی نہیں کہہ سکتی ہوں۔"

"اِس کی کوئی ضرورت نہیں ہے انجلی۔ وشال بولا۔ "غلط فہمیاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ پرنسپل بولے۔ انجلی کو صرف غلط فہمی ہوئی تھی لیکن اُس کا کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ یہ خط وشال کمار کے نام سے ہی آیا ہے لیکن بہرحال کوئی بھی آدمی کسی بھی نام سے کسی کو بھی خط روانہ کر سکتا ہے۔ اچھا تم میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ یہ خط اصل میں کس نے بھیجا ہوگا؟"

انجلی کو شاید معلوم نہ تھا لیکن وشال کو یقین تھا کہ یہ سب نوین کا کیا ہوا ہے۔ لیکن اُس نے بھی نوین کا نام لینا مناسب نہ سمجھا کیونکہ نوین کا نام لے کر وہ اس معاملے کو زیادہ طول نہ دینا چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ پرنسپل کے کمرے سے نکلے Carridor میں رُک کر وشال بولا۔

"مجھے افسوس ہے انجلی کہ ...... دیکھو پرنسپل صاحب کے سامنے میں نے تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ تمہارے بہت قریب بھی آگیا اور تمہارا ہاتھ تھام کر جانے

کیا کہہ بیٹھا لیکن وہ میری مجبوری تھی۔''

''مجھے معلوم ہے اور تمہیں افسوس ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن ایک بات تم مجھے ضرور بتا دو۔

''کون سی بات؟''

''وہ خط کس نے لِکھا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم لیکن یہ طے ہے کہ وہ بھی باہر کھڑا ہوگا۔''

''کون ہے وہ؟ بتا دو مجھے۔''

''کیا کرو گی اُس کا نام جان کر؟'

''میں ڈیڈی سے کہہ کر اُسے بُرباد کرادوں گی۔''

''نہیں انجلی۔ اُسے کوئی سزا دلوا کر اور خونخوار نہ بنا دو۔ اگر تمہیں اُس کا پتہ چل بھی جاتا ہے تب بھی تم ایسا ہرگز نہ کرنا۔ تم اُسے خود بھی تو سزا دے سکتی ہو۔''

''کیسے۔''

''اُس کے تن بدن میں آگ لگا کر۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں اور انجلی اُس کے لیے سب سے بڑا سزا یہی ہوگی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر باہر نکلیں۔

''اُس کے چہرے کا رنگ ایک دم اُڑ گیا۔ وشال فوراً بولا۔ ''میری بات سُن کر تم کیوں گھبرا گئی ہو؟ تم میری دوست ہو بس۔ اس کے آگے ہمارے درمیاں کوئی رشتہ نہ ہوگا۔

''رشتوں کی پرواہ نہیں ہے مجھے۔'' انجلی فوراً بولی۔ ''بس مجھے ڈر ہے کہ ہمیں اس حالت میں ممتا نے دیکھا تو وہ کیا سوچے گی؟۔ وہ بھی تو باہر ہی کھڑی ہوگی۔''

''ممتا کو میں سمجھا دوں گا۔''

''سمجھ تو جائے گی نا وہ۔''

''ہاں۔ تم اُس کی فکر نہ کرو۔''

انجلی نے خاموشی سے اُس کا ہاتھ تھام لیا تو وشال نے پھر اُس کے چہرے کا جائزہ لیا جس کا رنگ ہی اُڑا ہوا تھا۔ وہ بولا۔ تم تو ایسے گھبرا رہی ہو جیسے میں تمہیں اُڑا کے لے جا رہا

ہوں۔ ذرا مُسکرانے کی کوشش کرو۔''

''بہت مُشکل ہے۔''

''ناممکن نہیں۔''

جانے کیسے وہ مُسکرائی اور وشال کے ساتھ کمپاونڈ میں چلی آئی۔ جہاں تقریباً پورا ہی کالج جمع ہوگیا تھا۔ اُن دونوں کو ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اور مُسکراتے ہوئے دیکھ کر سب حیران ہوگئے۔ کہاں ابھی کچھ دیر پہلے انجلی وشال کی تباہی اور بربادی کی بات کر رہی تھی اور کہاں اب وہی وشال کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے مُسکرا رہی تھی؟۔ نوین اندر ہی اندر تلملا اُٹھا۔ وشال کو نیچا دکھانے کی اور اُسے برباد کرنے کی یہ سازش بھی ناکام ہوگئی تھی۔ وہ وہاں سے فوراً ہی نکل گیا۔ اُس کے ساتھ اُس کے کچھ خاص دوست بھی نکل گئے۔ باقی لڑکوں اور لڑکیوں میں طرح طرح کی سرگوشیاں ہونے لگیں۔ وشال کے دوستوں نے وشال کو گھیر لیا جن میں روی بھی شامل تھا۔ اُس کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔ ممتا دور کھڑی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ شاید اُسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وشال پرنسپل کے دفتر سے باعزت باہر نکلا ہے۔ انجلی اُس کے پاس چلی آئی۔ بولی۔

''تم اتنی دور کیوں کھڑی ہو۔''

''ایسے ہی''۔

''ایسے ہی یا دل میں کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔''

وہ ایسے مُسکرائی جیسے انجلی کی سوچ کا مذاق اُڑا رہی ہو۔ پھر بولی۔ ''تم کیا یہ سمجھتی ہو کہ تمہارا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دیکھ کر میرے دل میں اس لیے کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی ہوگی؟۔''

انجلی اُس کا بھروسہ دیکھ کر حیران ہوگئی۔ ممتا پھر بولی۔ ''ایسی بات نہیں ہے میری بہن۔ میں تو صرف یہ سوچ رہی ہوں کہ تم نے بہت بڑا احسان کیا ہے مجھ پر۔ تم نے میری لاج رکھی ہے۔ وہ اُس کے ہاتھ کو تھام کر اپنی بھیگی آنکھوں سے لگا کر بولی۔'' مجھے تو معلوم تھا کہ ایسی گری ہوئی اوچھی سی شرارت وہ نہیں کرسکتا ہے۔ اُس نے تمہیں

کیسے سمجھایا مجھے نہیں معلوم لیکن تم نے اُس کو سمجھ کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔"

"احسان کی کوئی بات نہیں ہے بہن۔ میں نے اُس کی باتوں میں چھپا ہوا سچ فوراً پہچان لیا تھا۔"

"تم یہ سچ وقت پر نہ پہچان لیتی تو وشال تو برباد ہی ہو جاتا اور...... اور میں بھی مر جاتی۔"

وشال چلا آیا تو انجلی وہاں سے نکلنے لگی۔ وشال نے رکنے کو کہا تو وہ بولی۔

"میرے سامنے شاید تم بات نہ کر پاؤ گے۔"

"تم اب غیر تو نہیں۔"

"ارے بابا دھیرے سے بولو۔ وہ مذاق کرتے ہوئے جلدی سے بولی۔" لوگ جانے کیا کیا سوچنے لگیں؟۔ ویسے بھی کئی دلوں میں کئی شک گزر رہے ہوں گے لیکن ایک بات ہے وشال۔ یہ جو موم کی گڑیا تمہارے پہلو میں کھڑی ہے۔ دکھنے میں تو موم جیسی ہے لیکن ہے بہت مضبوط۔ تم جلدی سے اسے اپنا بنا ڈالو۔ فائدے میں رہو گے کیونکہ ایسی گڑیا کسی کسی کو ہی نصیب ہوتی ہے۔"

"تم تو صرف اس کی تعریف کر رہی ہو، میرے بارے میں کیا خیال ہے؟۔" وشال نے بھی مذاق سے پوچھا۔"

وہ اس کے قریب چلی آئی۔ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی ہتھیلی دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔" تم سے شادی کر کے ممتا بھی فائدے ہی میں رہے گی۔ یہ دُنیا کے سب سے بہادر آدمی کی بیوی کہلائے گی۔ میں خالی خالی تعریف نہیں کر رہی ہوں۔ تم نے ابھی پرنسپل صاحب کے سامنے جو کیا تھا وہ شاید ایسے حالات میں سکندر بھی نہ کر پاتا۔" وہ تیزی سے وہاں سے نکل گئی۔ ممتا نے سوالیہ نظروں سے وشال کی طرف دیکھا لیکن تبھی گھنٹی بجی اور وہ کالج کی طرف چل پڑے۔

نوین چالباز تھا لیکن اُس کی ہر چال ناکام ہوتی جا رہی تھی اور اپنی ناکامیوں سے وہ بھی بوکھلا سا گیا تھا۔ بوکھلایا ہوا آدمی کسی زخمی شیر سے بھی وحشی اور خطرناک ہوتا ہے۔ چنانچہ وشال نے ممتا سے تاکید کی تھی کہ وہ کسی بھی حالت میں نوین کے مُنہ نہ

لگے۔ وشال کو بہار کے پھولوں کی، اُن کی خوشبو کی اور اُن کے تقدس کی بہت تشویش تھی۔ ممتا بھی بہت محتاط ہو کر رہ گئی تھی۔ بہار چمن کی ہوتی اور چمن مالی کا۔ ممتا نے اپنے پورا چمن اپنے مالی، اپنے وشال کے نام لکھ دیا تھا۔ پھول اور بہار تو دور کی بات وہ اپنی مہک بھی کسی کو محسوس کرنے کی اجازت دینے کو تیار نہ تھی۔

کالج سے نکل کر وہ یونیورسٹی میں پہنچے۔ کالج اگر جوانی کا شروع کا دور ہے تو یونیورسٹی جوانی کی اصل پہچان کا دور ہوتا ہے۔ بڑھتی عمر انسانی خیالات کو بھی جوان کر دیتی ہے۔ خیالات کو محبت کے حسین رنگ اور بھی نکھار دیتے ہیں۔ وشال اور ممتا بھی نوجوانی کے اُس دور میں آ گئے تھے جہاں اُن کے خیالات جوان ہو گئے تھے اور اُن خیالات کو محبت کے حسین رنگوں نے اور بھی نکھار دیا تھا۔ دوریاں اب برداشت سے باہر تھیں۔ روح میں، ذہن میں، دل میں، جگر میں، آنکھوں میں بس وصل کی آگ تھی۔ گو کہ آگ سلگتی رہی، انہوں نے کبھی شعلہ نہ ہونے دی۔ انہوں نے تہذیب اور تقدس کو بھی نذرِ آتش نہ ہونے دیا۔ ہاں آگ تھی، تپش تھی، جلن تھی۔

نوین بھی ان کے ساتھ یونیورسٹی میں چلا آیا تھا۔ ان ہی دنوں گپتا جی ریاستی سرکار میں وزیر ہو گئے تو پھر یونیورسٹی میں نوین کی جی حضوری میں کوئی کمی نہ رہی۔ کہتے ہیں وزیر کا بیٹا وزیر سے بھی بڑا ہوتا ہے کیونکہ عام لوگوں کی پہنچ براہ راست وزیر تک نہیں ہوتی ہے لیکن وزیر کے بیٹے کی جی حضوری کر کے لوگ اپنا مطلب نکال ہی لیتے ہیں۔ یونیورسٹی میں اور بھی کالجوں سے لڑکے آئے تھے۔ جن میں شہر کا ایک بڑا رئیس زادہ چوپڑہ بھی تھا۔ بڑے لوگوں کی دوستی بڑے لوگوں سے ہی ہوتی ہے۔ بھلے ہی دشمن چھوٹے لوگوں سے کیوں نہ ہو؟۔ دوستی کرتے وقت وہ اپنے گھر، سوسائٹی، پوزیشن اور اپنی حیثیت کا خیال ضرور رکھتے ہیں، بھلے ہی دشمنی کرنے میں وہ یہ خیال نہ رکھتے ہوں۔ نوین کی دوستی کے لیے چوپڑہ تھا تو دشمنی کے لیے وشال تو تھا ہی۔ چوپڑہ کے ساتھ دوستی کے بعد نوین کی طاقت میں اضافہ ہو گیا۔ تو وہ خود کو سکندر اور چنگیز سے بھی بڑا سمجھنے لگا اور اپنی من مانی میں وہ کئی بار ممتا کے ساتھ بھی زیادتی کر بیٹھا لیکن وشال کے سمجھانے پر وہ سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ اُس کی خاموشی سے نوین

حوصلہ ہی پا گیا اور ایک دن جب وہ بس اسٹاپ پر وشال کے ساتھ کھڑی تھی تب نوین نے اُن کے سامنے اپنی کار روک لی۔

''ہیلو''۔وہ اپنا چشمہ اُتارتے ہوئے ممتا سے بولا۔''دھوپ میں کیوں کھڑی ہو؟۔آؤ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔''

ممتا کو یہ سب بہت بُرا لگا۔اُس نے وشال کی طرف دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں اُترا ہوا خون دیکھ کر وہ ڈر گئی کہ وہ کہیں نوین کے منہ نہ لگ جائے اور نوین کے ہاتھ وشال سے لڑنے کا بہانہ مِل جائے۔نوین پھر بولا۔

''میں تم سے کہہ رہا ہوں مُمتا رانی۔''

''شٹ اپ۔''وہ بس اتنا ہی بولی۔

''غصہ بھی بہت پیارا ہے تمہارا۔''وہ ڈھٹا رہا۔بولا۔''ائیر کنڈیشن گاڑی ہے۔بیٹھوگی تو فوراً غصے کی گرمی اُتر جائے گی۔''

''شٹ اپ۔''اِس بار وہ دہاڑ کے بولی۔''تم اپنی ائیر کنڈیشن کار کے گھمنڈ میں یہ نہ سوچو کہ تم ہر کسی لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہو۔''

''میں تو بالکل ایسا ہی سوچتا ہوں۔''وہ بڑی بے شرمی سے بولا۔''اور تم سے میرا وعدہ رہا کہ ایک دن تمہیں اپنے ساتھ لے جا کر ہی رہوں گا۔تمہاری رضامندی سے نہ سہی، زبردستی ہی سہی۔''

بہت دنوں سے وشال بہت کچھ برداشت کرتا آیا تھا۔نوین کی ہر بے تُکی حرکت کو سہتا آیا تھا لیکن یہ سارا تماشہ اُس سے بالکل ہی برداشت نہ ہوسکا تھا لیکن اِس سے پہلے کہ وہ کچھ کر پاتا نوین اُس کا ارادہ بھانپ چکا تھا وہ تیزی سے وہاں سے نِکل گیا۔ وشال غصے سے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔وہ مُمتا کی طرف دیکھ کر غصے سے بولا۔

''بے شرمی کی بھی حد ہوگئی۔یہ امیر زادہ اپنے آپ کو خدا جانتے ہیں کیا کہ جو بھی کرنا چاہیں، کہنا چاہیں کرسکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں؟۔''

مُمتا کچھ نہ بولی تو وہ پھر بولا۔''بدنصیبی کہو یا تم اِس کو بے شرمی ہی کہو کہ ہم سب کچھ چُپ چاپ سہہ لیتے ہیں، گویا ہماری کوئی قیمت نہ ہوئی، عزت نہ ہوئی۔''

''ہماری تو قیمت بھی ہے اور عزت بھی ہے۔''ممتا بڑی سنجیدگی سے بولی''اور اُن کی باتوں کو چُپ چاپ سہہ لینا نہ ہماری بدنصیبی ہے اور نہ بے شرمی۔''

''پھر کیا ہے یہ؟۔''

''یہ ہماری بزدلی اور بے غیرتی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ میں بُزدل اور بے غیرت ہوں؟۔''

''نہیں۔تم بہت بہادر ہو۔''

''شٹ اپ مُمتا۔''وہ غصے سے بولا۔''تم مجھ پر تیر پھینک رہی ہو۔''ارے میں تو کبھی نہ کبھی اُسے ضرور قتل کروں گا۔دے دیتا ہے قانون مجھے ایک وزیر کے بیٹے کے قتل کے لیے عمر قید کی سزا یا پھانسی کی سزا تو دے دے لیکن نوین جیسا کمینہ آدمی تو ختم ہو جائے گا اور شاید اُس کا حال دیکھ کر اُس جیسے اور کمینے بھی سبق سیکھ لیں۔

''نہیں۔''وہ گھبرا کے بولی۔ایسا غضب نہ کرنا۔''

''کیا ہوگا؟۔''وہ پھر غُصے سے بولا۔میری موت ہوگی لیکن پھر ہر لڑکی آرام سے بس کا انتظار تو کر سکے گی۔''

وہ بہت غصے میں تھا اور اُس کے غصے سے ممتا خوف کھا رہی تھی۔وشال کا غصہ کم کرنے کے لیے وہ کچھ کرنا چاہتی تھی۔اس لیے وہ زبردستی مُسکرائی۔وشال اس کی مُسکراہٹ سے خُندق کھا کر بولا۔''تم کیوں مُسکرا رہی ہو،کیا میں نے کوئی غلط بات کہی؟۔''

''نہیں لیکن میں تمہیں ایک مشورہ دوں گی۔''

''کیا......؟''

''تم نوین جیسے لوگوں کے قتل کے لیے کہیں سے اے۔کے 47 رائفل لے آو۔

''اُس سے کیا ہوگا۔؟''

ایک فائدہ یہ ہوگا کہ جس پر گولی چلاؤ گے وہ ضرور مر جائے گا اور دوسرا فائدہ یہ کہ تمہیں سزا بھی نہیں ملے گی۔

''وہ کیسے......؟ سزا تو ملنی ہی ہے۔''

''ہاں سال دو سال کی جیل ہو سکتی ہے۔ کوئی بڑا سزا نہیں۔ بڑی سزا تو چاقو مار کر ہلاک کرنے پر ملتی ہے۔

''یہ تم کیا اناپ شناپ بک رہی ہو۔''

''سچ کہہ رہی ہوں میں۔ میں نے اے۔ کے 47 والے قاتل کو سزائے موت ہوتے نہیں سُنا ہے نا عمر قید کی سزا ملتے سُنا ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ جسے قتل کرتے ہیں وہ جلدی مر جاتا ہے اور چاقو سے ہلاک کیا جانے والا آدمی تڑپ تڑپ کے مرتا ہے۔ اس لیے چاقو سے مارنے والے کو زیادہ سزا ملتی ہے۔''

''تو میں بھی دہشت پسند بنوں۔''

''میں شان سے کہوں گی، آزادی زندہ باد۔''

''پکڑ کے لے جائے گی پولیس۔''

''جیل میں مگر سب کچھ دستیاب ہوگا۔''

''سب کچھ......؟''

''ہاں۔ کھانا، پینا، ریڈیو، اخبار، ٹیلی ویژن، پنکھا اور......وہ مُسکرا کے بولی۔

''تم بھی۔''

''میں کیسے۔''

''میں بھوک ہڑتال کر کے تمہیں بھی منگاؤں گی، اُسی جیل میں۔''

''تمہاری مانگ قبول کی جائے گی۔''

''نہ کریں تو میں انسانی حقوق کی رکھوالی کرنے والوں سے شکایت نہ کروں گی۔''

''وہ تم سے نہ کہیں گے کہ میں قاتل ہوں اس لیے مجھے یہ رعایت نہیں دی جا سکتی ہے۔''

''تم نے تو قتل اے۔ کے 47 سے کیا ہوگا۔ رعایت تو ملتی ہی ہے۔'' وہ مُسکرائی۔ بولی۔ ''نوین کے قتل کا ارادہ چھوڑ دو۔ وہ جو کہتا ہے، وہ جو کرتا ہے صرف تمہیں لڑنے کے لیے اُکسانے کے نلیے کر رہا ہے۔ وہ تم سے لڑنے کے بہانے کی

تلاش میں ہے، ورعقل مندی یہ ہے کہ تم اُسے ایسا موقعہ ہی نہ دو۔ ہاں تمہارا غصہ بہت اچھا تھا۔ آج پہلی بار تمہیں غصے میں دیکھا ہے۔ بہت پیارے لگتے ہو۔"

وہ پگھل سا گیا۔ ایک سکون سا اس کے اندر چلا آیا۔ تناؤ ختم ہو گیا۔ لگا جیسے سمندر کا وہ طوفان تھم گیا ہو جو ابھی اُچھل اُچھل رہا تھا اور بڑا بھیانک دِکھ رہا تھا۔ سچ ہے۔ ممتا نے سوچا۔ کلاشنکوف اور آر ڈی ایکس سے کسی کی مسکراہٹ زیادہ کارآمد ہے۔ مسکراہٹ سے زیادہ گولیاں چلتی ہے، زیادہ بڑا دھماکہ ہوتا ہے۔ اُس نے سوچا کہ کوئی کلاشنکوف اور آر ڈی ایکس والوں کو مسکراہٹوں کے ہتھیار تھما دے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تب ہی ایک لڑکی آرام سے بس اسٹاپ پر بس کا انتظار کر سکے گی۔ فائدہ یہ بھی ہے کہ کسی کو سزا بھی نہ ملے گی۔

تھوڑی دیر میں بس آ گئی تو وہ بس میں بیٹھ گئے۔ وشال اب کسی خوبصورت موسم کی طرح لگ رہا تھا لیکن ممتا کو پھر بھی ڈر تھا کہ کہیں اُس کا سامنا نوین سے نہ ہوا اور کہیں وہ پھر طوفان نہ بن جائے۔ اس لیے وہ پورا دن اُس کے ساتھ ساتھ رہی۔ اُسے اپنے ساتھ ساتھ دیکھ کر وشال بولا۔

"تم ٹھیک تو ہو نا؟"۔

"کیوں، کیا ہوا مجھے۔"

"تم آج پورا دن میرے ساتھ رہی ہو۔ میں نے سوچا کہیں تمہارا ارادہ گر کر میری بانہوں میں آنے کا تو نہیں ہے۔؟" اُس نے بڑے ہی پیار سے وشال کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی نظریں جھکا کر بولی۔ "تم نے کبھی اپنی باہیں اُٹھا کر مجھے اُن میں آنے کی اجازت ہی نہ دی ہے۔"

"میں تمہارا، باہیں تمہاری، جب چاہو چلی آؤ۔ گھر ہی تمہارا ہی ہے پھر تمہیں بلانے کی کیا ضرورت ہے؟"۔ "بہر حال کیا بات ہے کہ صُبح صُبح سے تم میرے ساتھ ہو۔"

"کیا تمہیں یہ اچھا نہیں لگا؟"۔

"اچھا......؟ ارے میں تو کہتا ہوں کہ دن کبھی ختم نہ ہوتا کہ تم میرے ساتھ رہو۔"

"ایسا تو میں بھی چاہتی ہوں لیکن میں بہ بھی چاہتا ہوں کہ تم نوین سے کوئی جھگڑا

مول نہ لو۔''

''ممتا''۔ وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ''کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ مجھے اپنے جیون کے سارے پھول تمہاری بھینٹ چڑھا کر ابھی سے تمہاری پوجا شروع کرنی چاہئے یا پھر مجھے تمہارے قدموں میں اپنے جیون کا ہر پل قربان کرنا چاہئے۔ تم صبح سے اس لیے میرے ساتھ رہی ہو کہ کہیں سے میں اُس کمینے کے مُنہ نہ لگ جاؤں۔ ممتا تمہیں بس ممتا کہنا تو پاپ ہے۔ تم دیوی ہو، تم زندگی ہو، تم زندگی کا سہارا ہو، جی کرتا ہے کہ تمہیں بانہوں میں چھپالوں یا پھر...... یا پھر تمہاری بانہوں میں چھپ جاؤں۔

''تم تو بہت Sentimental ہو گئے۔''

''یونیورسٹی کے یہ کچھ آخری دن بچے ہیں ممتا۔ ان بچے ہوئے دنوں میں اُس کے مُنہ لگ کر میں اپنی محبت کو بدنام نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ یہ چند دن بھی گزر جائیں گے۔ ہم اپنی اپنی ڈگری لے کر جب یہاں سے جائیں گے تو جلدی سے جلدی کوئی نوکری ڈھونڈ کر کے میں تمہیں بیاہ کر کے اپنے گھر لے جاؤں گا۔ جی بھر کے پیار کروں گا تمہارے ساتھ۔ تم...... تم بھی پیار کرنا میرے ساتھ۔ پھر میں ہمارے درمیان کسی کو آنے کی اجازت ہرگز نہ دوں گا کیونکہ پھر میں تم پر اپنا پورا حق جتا کر تمہاری رکھوالی کر سکوں گا۔ تم بے فکر رہو۔

ممتا کی آنکھوں میں بھی یہی سپنے تھے۔ دونوں کے سپنے یکسان تھے۔ ایک ہی منزل تھی، ایک ہی راہ تھی، ایک ہی ڈگر تھی، ہم قدم تھے وہ۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے وہ اپنے سپنوں کی تعبیر کو کھوجنے نکلے تھے۔ یونیورسٹی میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ ایک طرح کے لوگ وہ بھی تھے جن کی فطرت میں بس پیار بانٹ لینا تھا اور اُن ہی لوگوں میں وشال بھی تھا اور ممتا بھی تھی۔ پیار بانٹ لینے کی فطرت نے اُن کے بہت دوست بھی بنائے تھے گو کہ کچھ دشمن بھی باقی تھے۔ چوپڑہ کو کار کا حادثہ ہوا تو اتفاق سے اس کے پاس وشال اور ممتا ہی سب سے پہلے آپہنچے۔ وہ فوراً ہی اُسے اسپتال لے گئے اور جب تک اُس کے گھر والے نہ چلے آئے تب تک وہ اُس کے ساتھ رہے۔ جب جانے لگے تو چوپڑہ نے اپنی نم ناک آواز میں کہا۔

''بہت بہت شکریہ میرے دوستو۔''

''کس بات کا شکریہ کر رہے ہو؟۔'' وشال نے پوچھا۔ اُس حادثے کے بعد تمہیں کوئی بھی اہسپتال پہنچا دیتا۔

''میں اس بات کے لیے تمہارا شکریہ ادا کر رہا ہوں کہ آج تم نے میر آنکھیں کھول کر مجھے پیار کا مطلب سکھا دیا ہے۔ میں تو جانے کس گمنڈ میں پیار اور محبت کا مطلب سمجھ لینے کو تیار ہی نہ تھا لیکن تم دونوں نے مجھے سب کچھ سکھا دیا ہے۔

''پیار تو ہر دل میں ہے۔'' وشال بولا۔ تمہارے دل میں بھی ہے۔ کیا ہوا کہ ذرا دیر سے جاگا۔ جاگا تو سہی۔

چوپڑہ نے واقعی اُن سے پیار کا مطلب سیکھا تھا۔ تو وہ نوین کو بھی سکھانے لگا۔ نوین یا تو سیکھ نہ پایا یا اُس نے سیکھنے کی کوشش نہ کی یا پھر چوپڑہ ہی اُسے سکھا نہ پایا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اُس کے بعد جتنی دیر تک وہ یونیورسٹی میں رہے اتنی دیر نوین پھر کبھی دریودھن نہ بن سکا اور نہ ہی ممتا کو دُرپدی سمجھ کر اُس کی بے عزتی کرنے کی ہمت کر سکا۔ گویا کہ مہا بھارت کی جنگ رُک گئی تھی یا اُسے ٹالنے کا کوئی سمجھوتا کیا گیا تھا۔ آخر ہر دور میں کروکھیشتر لال نہیں ہو جاتا ہے۔ چند ایک سال ہریالی کے بھی ہوتے ہیں۔

کچھ دنوں میں وہ دُونوں یونیورسٹی سے اپنی اپنی ڈگری لے کر نکلے تو دونوں کی آنکھوں میں چند صاف سُتھرے سپنے تھے۔ وہ محبت کی تمام منزلیں طے کر کے اپنے لیے ایک خوبصورت سی دُنیا بسانا چاہتے تھے جس میں ہر گھڑی، ہر پل اُن کو ایک دوسرے کا ساتھ نصیب ہو، پیار نصیب ہو، وشال نے اُسے پوچھا۔

''ماں کو اب تمہارے گھر بھیج دوں؟۔''

''کیوں؟۔''

''شادی کی بات کرنے کے لیے۔''

''ابھی کیا جلدی ہے؟۔''

وہ بڑے پیار سے اُس کی طرف دیکھ بولا۔ سچ بتاؤں ممتا۔ اب یہ دوری

برداشت نہیں ہوتی ہے۔''

''دوری کس سے برداشت ہوتی ہے لیکن پہلے تم اپنی نوکری کا انتظام کرلو۔

''نوکری بھی مل جائے گی۔''

''ہاں'' جب نوکری ملے تب ہی تم شادی کے سپنے دیکھ لینا کیونکہ ہمارے خاندان میں رواج ہے کہ لڑکی چاہے جیسی بھی ہو شادی سرکاری نوکر سے ہی ہو جاتی ہے۔ ہماری شادی کے لیے شاید کوئی بھی منع نہ کرے گا وشال لیکن ہماری شادی کے لیے یہ شرط ضرور رکھی جائے گی کہ پہلے تم نوکری حاصل کرلو تب ہی تم اپنے اور میرے سپنوں کو پورا کرسکو گے۔''

''تو میری نوکری ہماری محبت کی شرط ہوگی ؟''

''محبت کی نہیں بلکہ شادی کی۔''

''اگر میں یہ شرط پوری نہ کرسکا تو......؟''

''ایسا نہ کہو وشال۔'' وہ تڑپ اُٹھی۔

''مان لو کہ میں یہ شرط پوری نہ کرسکا تو کیا ہم نہ مل پائیں گے۔

وہ کچھ دیر تک اندر ہی اندر کچھ سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ میں تو میں ہوں۔ تم بے روزگار ہو تو تمہارے قدموں میں پڑی ہوں۔ تم کماؤ ہو جاؤ گے تو بانہوں میں بھی بھر لینا۔ نہ بھی ہوئے تب بھی جب آواز دو گے چلی آؤں گی میں تو کب سے اپنی روح سے تمہیں اپنا پتی مان چکی ہوں۔ چاہے اس سماج کی نظریں یہ سب نہ دیکھ سکیں مگر میری تو نظروں میں تم ہی میرے پتی ہو۔

''تھینک یو ممتا۔ میں سماج کی رکھی ہوگی یہ شرط پوری کر کے ہی رہوں گا اور تم اپنے سماج سے یہ بھی کہہ دینا کہ وہ چاہے جو بھی شرط رکھے میں پوری کروں گا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

بچپن سے ہی وشال کو بتایا گیا تھا کہ پڑھ لکھ کر اُسے نوکری ملے گی اور اُس نوکری سے ہی اُسے اُس کی روٹی عزت اور ہر خوشی ملے گی اس لیے بچپن سے ہی وہ اُس بتائی گئی نوکری کو حاصل کرنے کے لیے اپنے رات دن کو ایک کرتا آیا تھا۔ گویا وہ نوکری،

نوکری نہ ہوئی بلکہ اُس کی منزل ہوئی۔ جب ممتا اُس کے جیون میں چلی آئی اور جب ممتا نے اُسے محبت کا مطلب سمجھایا تب بھی اُس نے یہی سوچا تھا کہ ممتا کے ساتھ ساتھ نوکری اس کی منزل ہے۔ اس نے یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد سوچا تھا کہ نوکری ملتے ہی وہ مدتوں پرانے اپنے سپنے پورے کرے گا۔ وہ ممتا کو اپنی دولہن کو اپنی دولہن بنالے گا۔ اُسے اپنے گھر لے آئے گا۔ اپنے گھر کو اور اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر دے گا۔ یہی اُس کی زندگی کا پہلا سپنا تھا، پہلا مقصد تھا۔ پہلی آرزو تھی اور اس کے لیے اُس نے مُفلسی کی مار سہتے ہوئے جانے کتنی چھوٹی بڑی کتابیں پڑھ پڑھ کر اور جانے کتنی دیر راتوں میں جاگ جاگ کر یہ ڈگری حاصل کی تھی۔ چنانچہ اس ڈگری کے سُہارے وہ نوکری کی تلاش میں لگ گیا۔ اس سلسلے میں اُس نے موہن بابو سے بھی بات کی تو انہوں نے یہ کہہ کر اس کا حوصلہ بڑھایا کہ وہ کوشش کرلے تو اُسے نوکری ضرور ملے گی۔

''ہاں'' وشال بولا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ مُمتا بھی یہی کہتی ہے۔''

''تم بہت خوش نصیب ہو بیٹے کہ تمہیں مُمتا جیسی اچھی لڑکی کا ساتھ ملا ہے۔ تم دونوں کی جوڑی ایک بے مثال جوڑی ہوگی۔ اِسلیئے زندگی بھر کے لیے ممتا کا ساتھ حاصل کرنے کے لئے تم ابھی سے نوکری حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ مختلف امتحانوں میں بیٹھ جاؤ۔ تم امتحان پاس کروگے تو نوکری بھی ملے گی۔''

موہن بابو کی بات درست تھی۔ انہوں نے وشال کا حوصلہ بڑھایا تھا۔ ویسے بھی وشال کے پاس حوصلوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ حوصلے اِسلیئے بھی اُسے کرنے تھے کیونکہ اُس نے ممتا کو پانا تھا۔ حوصلے اِسلیئے بھی اُسے کرنے تھے کہ اُسے روٹی چاہیے تھے۔ اُس نے اپنی کوششوں میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ جانے کہاں کہاں سے، کس کس سے، کون کون سی کتابیں لے لے کر وہ پڑھتا رہا۔ جوش اور ولولہ روح سے۔ ذہن سے اور دل سے بڑھتا گیا۔ اُس کا حدف اُسکی نظروں کے سامنے تھا۔ کوئی ہمالیہ کے اُس پار نہ تھا۔ نہ سات سمندر پار تھا۔ ماں نے بھی اُسکے حوصلے بڑھائے۔ بولی۔

''تمہارے پتا جی کہتے تھے کہ محنت سے کچھ بھی ہوسکتا ہے۔

''وہ ٹھیک کہتے تھے ماں۔ میں بھی محنت کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ مجھے جلدی کامیابی ملے گی۔''

''بھگوان کرے کہ ایسے ہی ہو۔'' ماں نے دل کی عمیق گہرائیوں سے دُعا دی۔ تم تمہارے باپ کے اسی لیے پیارے تھے کہ تم میں ہمت ہے۔ وہ تم سے بہت پیار کرتے تھے نا؟۔ مجھ سے بار بار کہتے تھے کہ وشال خاندان کا نام روشن کر گے گا۔''

''میں پوری کوشش کروں گا ماں کہ پتاجی کا ہر سپنا پورا ہو۔''

''ہاں''۔ تم کندن اور رجنی کی خبر کیوں نہیں لے آتے ہو؟ سُنا ہے کہ تم بہت جلد چاچا بن رہے ہو۔''

وشال کو یہ خبر سُن کر بہت خوشی ہوئی لیکن تبھی اُس نے پوچھا۔ تمہیں کس نے بتایا ماں؟۔''

''رجنی کی ایک موسی ملی تھی۔ اُس نے بتایا۔''

''یعنی رجنی نے اس بارے میں تمہیں خط نہ لکھا۔''

''نادان ہے وہ لیکن تم تو نادان نہ ہو۔''

''مجھے یہ سُن کر بہت خوشی ہوئی ہے ماں کہ میں چاچا بن رہا ہوں لیکن یہ خوشی بٹورنے کے لیے میں اُن کے پاس نہ جاؤں گا اور تم بھی مجھے اس کے لیے مجبور نہ کرو ماں۔'' وشال تیزی سے وہاں سے نکل گیا۔ کیونکہ اُسے ممتا سے مل کے جانا تھا۔ ممتا نے اُس کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر پوچھا۔

''کس سے لڑ کر آئے ہو۔''

''نہیں تو۔''

''پھر چہرہ کیوں اُترا ہوا ہے۔؟''

وشال اُسے گھر کی بات کہنا نہ چاہتا تھا لیکن ممتا کے پیار سے وہ موم کی طرح پگھل گیا تو اُس نے ممتا کو ساری بات بتا دی۔ ممتا اس کے جذبات کی قدر کرتی تھی۔ اس لیے اُس نے بھی اُسے اُس کے بھائی اور بھابھی سے ملنے کا مشورہ نہ دیا اور بات کو دوسری طرف لے گئی اور پھر اُن کی گفتگو وشال کی نوکری پر آ کر ٹھہر گئی۔ وشال پڑھائی کرتا رہا۔ امتحانوں میں بیٹھتا گیا۔ اکثر اُن میں کامیاب بھی ہو کر نکلا لیکن ہر

بار وہ نوکری حاصل کرنے سے رہ گیا۔ نا اُمیدی نے کئی بار اُسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ شاید سرکاری نوکری ہی اُس کے نصیب میں نہیں ہیں اور یوں اُس کے نصیب میں روٹی نہیں ہے، عزت نہیں ہے، خوشی نہیں ہے اور ممتا نہیں ہے۔ اُس کا ہر حوصلہ پست ہوتا گیا۔ اُس کی ہمت کم ہوتی گئی۔ جوش ٹھنڈا پڑتا گیا۔ ہر ولولہ دھبتا گیا۔ اُس کی نظروں کے سامنے رکھا ہوا اُس کا حدف دھیرے دھیرے اُس سے دور ہوتا گیا یا وہ خود ہی اُس سے بچھڑتا گیا۔ ممتا لکچرر ہو گئی تو اُسے لگا کہ اب اُس کا حدف اُس کے ہاتھ کی دوری پر نہیں ہے بلکہ ہمالیہ کے اُس پار ہے یا پھر سات سمندر پار ہے جسے پا لینا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ وہ موہن بابو کے سامنے ایک سوالیہ نشان کی طرح کھڑا ہو گیا۔

''دیکھا آپ نے؟'' وہ بولا۔ گرمیوں میں پسینہ میں نے بہایا۔ سردیوں میں ٹھنڈ کو میں نے سہہ لیا۔ رات دن میں نے ایک کیے۔ اپنی آنکھوں کی روشنی پڑھائی میں میں نے کم کی۔ جاگ جاگ کر پڑھائی میں نے کی۔ امتحان میں کامیاب میں ہوا، انٹرویو کا سامنا کرتے ہوئے ہر سوال کا ٹھیک جواب میں نے دیا لیکن......؟''

''یہی بدنصیبی ہے ہمارے سماج کی۔ موہن بابو سنجیدگی سے بولے۔'' یہاں ہر کام کے لیے رشوت چاہئے ہوتی ہے۔ چاہئے وہ پیسے کی صورت میں ہو یا کسی اور صورت میں۔ دراصل یہاں آدمی کی پہچان اُس کی جیب کی وزن سے کی جاتی ہے یا پھر سماج مین اُس کے رُتبے سے کی جاتی ہے۔

''میں بھی یہی کہتا ہوں۔'' وہ فوراً بولا۔ میرے پاس رشوت دینے کے لیے پیسے نہیں ہیں لیکن نوکری حاصل کرنے کی بہت ضرورت ہے اس لیے آپ میری سفارش کریں تو......؟''۔

''میں......؟''۔

''ہاں۔ آپ کی تو سب عزت کرتے ہیں۔ آپ کسی کو میرے بارے میں کہیں گے تو وہ انکار نہیں کرے گا۔''

''نہیں۔'' وہ فوراً بولا۔ ''تم جانتے ہو وشال کہ میں رشوت دینے والے اور لینے والے دونوں کے خلاف ہوں۔ میں کسی کی سفارش کر کے دوسروں کا حق مارنے

کے خلاف بھی ہوں۔ اس بات کا تم بُرا نہ مان لینا وشال۔ تم جانتے ہی ہو کہ میں نے اپنی پوری زندگی چند ایک اصولوں کے بھینٹ چڑھائی ہوئی ہے اور وہ اصول مجھے میری زندگی سے بھی پیارے ہیں بلکہ میں تو اُن اصولوں کو ہی اپنی دھڑکنیں بنا کر جی رہا ہوں۔ مجھے تم سے بہت پیار ہے لیکن اُس پیار کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر تم میرے اصولوں کو توڑنے کی کوشش مت کرو۔ میری پوری زندگی تباہ ہو جائے گی کیونکہ کسی بھی جگہ کسی بھی نوکری کے لیے تمہارے نام کی سفارش کرنا میری آتما کی نظروں میں کسی اور کا حق مارنے کے برابر ہے۔

وہ ٹوٹ گیا، ٹوٹا ہوا تو وہ پہلے ہی تھا لیکن اُس کے ٹوٹے ہوئے وجود کے بھی حصے ہو گئے۔ لگا جیسے آدمی کھلونا ہے اور ضرور ٹوٹ جاتا ہے۔ وشال کو واقعی نوکری کی بہت جلدی تھی لیکن اِس کی اُسے کوئی اُمید نظر نہ آ رہی تھی جب کہ ممتا لکچرر ہو گئی تھی اور نوین بھی ایک اچھے عہدے پر فائز ہو گیا تھا۔ وشال کے لیے اُس کی ماں بھی پریشان تھی اور ممتا بھی۔ اکثر ممتا اُس کے ساتھ یہی باتیں کرتی رہتی تھی۔ ایک دن وہ انٹرویو سے لوٹ آیا تو وہ بہت اُداس لگ رہا تھا۔ ممتا اُس کی اُداسی کی وجہ جان چکی تھی۔ بولی۔

"آج بھی نہ ہو سکا تمہارا کام؟۔"

"میرا کام نہ ہو گا ممتا اور اگر کبھی ہوا بھی تو تب ہو گا جب وہ لوگ میرے سے اچھے سوال پوچھیں گے۔"

"یعنی تم اُن کے سوالوں کے جواب نہیں دے پاتے ہو۔"

"وہ سوال پوچھیں گے تو میں جواب دوں۔" وہ فوراً بولا، اور سوال بھی ایسے ہوں کہ جن کا کوئی مطلب ہو۔ سگریٹ نہ پینے والے سے وہ سگریٹ کی لمبائی پوچھیں گے تو کیا جواب دے گا آدمی؟ اگر دے بھی دے تو وہ کہیں گے کہ کسی خوبصورت لڑکی کے لبوں پر زیادہ سے زیادہ سجنے والی لالی کا نام بتا دو جیسے آدمی ہر آتی جاتی لڑکی کے لبوں کو دیکھتا ہو یا پھر جیسے انہوں نے آدمی کو کسی سرکاری دفتر میں نوکری نہ لگانا ہو بلکہ کسی پنواری یا منیاری کی دوکان پر بٹھانا ہو۔ مجھے تو لگتا ہے کہ نہ اُن لوگوں کی بکواس کبھی پوری ہو گئی اور نہ ہی میری تلاش کبھی پوری ہو گی۔

''تم نا اُمید تو نہ ہو جاؤ۔''

''تو کیا کروں۔؟۔''

''تم ایک بار موہن بابو سے بات کرلو۔''

''اُن سے کیا بات کروں؟۔ وہ تو ایک بن سپنوں کے انسان ہیں۔ اُن کا کوئی اپنا بھی سپنا ہوتا تو وہ بھی کسی اور کے سپنوں کی قدر کرتے۔ اُن کی بھی کوئی اپنی ممتا ہوتی تو وہ بھی دوسروں کے دلوں کا حال جان سکتے۔ اُن کا دل تو ڈھڑکتا ہی نہیں ہے۔ وہ تو بس وہ ہیں۔ سپنوں اور خوابوں کے بغیر جینے والا آدمی۔ وہ مجھے پہلے ہی ایسی کسی مدد سے انکار کر چکے ہیں کیونکہ اُن کے خیال میں کسی کی سفارش کر کے نوکری دلوانا کسی اور آدمی کا حق مارنے کے برابر ہے۔

''حق......؟'' وہ تلخی سے بولی۔ موہن بابو جیسے اصول پرست آدمی کے ساتھ رہ کر تم بھی اصول پرست بن گئے ہو۔ اصولوں کی میں مخالفت نہیں کرتی ہوں لیکن کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ جگہ جگہ تمہارا حق بھی مارا جاتا ہے۔؟

''ہاں......تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

''سو فیصدی ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔ موہن بابو کو کیا معلوم کہ کسی کی ضرورتیں کیا ہوتی ہیں؟۔ وہ تو نہ کسی کے ہیں اور نہ ہی کوئی اُن کا ہے۔ دراصل گھر، کنبے اور دُنیا کے اخراجات کا اُن کا پتہ ہی نہیں ہے۔ اُن کے کھیتوں سے اُن کا اناج آتا ہے تو وہ سوچتے ہیں کہ شاید سب کے کھلیان بھرے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے چند اصولوں میں جکڑے ہوئے قدرت کے اور دُنیا کے اصول نہیں دیکھتے ہیں۔ اُن کی دُنیا تو بس اُن کے اصولوں تک ہی محدود ہے لیکن تم خود کو اُن کے اصولوں میں جکڑ کر کیوں میرے اور اپنے سپنوں کے ساتھ کھیل رہے ہو؟۔ وہ تمہیں روشنی کا راستہ دکھانے کو تیار نہیں ہیں تو تم روشنی کا کوئی اور راستہ تلاش کرو۔ کسی اور آدمی کو تلاش کرو جو اصولوں میں جکڑے ہوئے کسی بے بس پنچھی کی طرح نہ ہو۔ تم اُسے رشوت کے پنکھ لگا کر کھلی فضاؤں میں اُڑان بھرا دو۔ وہ تم کو اُڑان سکھائے گا اور جب تم کھلی فضاؤں میں اُڑان بھر سکو گے تب ہی تم کسی کی مانگ میں سیندور بھی بھر سکو گے۔

''وہ کہیں کھو گیا۔ لگا جیسے ابھی اُڑان بھرے گا۔ کھلی فضاؤں میں پرواز کرے گا۔ ممتا نے پوچھا۔

''کیا میں نے کوئی غلط بات کہی؟''

''نہ......نہیں تو۔''

''پھر تم کیا سوچنے لگے تھے؟''

''میں کسی کی مانگ میں سیندور ڈالنے کی بات سوچ رہا تھا۔ ممتا کیا میں کبھی ایسا کر سکوں گا؟''

''ہاں مگر شرط تمہاری نوکری ہے۔ تم کسی اور کے حق کی رکھوالی بعد میں کرنا۔ پہلے اپنا حق حاصل کر لو۔ فرض اور حق میں رشتہ یہی ہے کہ فرض نبھاؤ تو حق ملے۔ حق نہ ملے تو حق ملنے کے بعد ہی فرض نبھاؤ۔ ممتا کی بات سو فیصد درست تھی۔ وشال نے سوچا کہ رشوت کا سہارا لیے بغیر اُسے نوکری ملنا ناممکن ہے لیکن رشوت کے پیسے وہ لائے تو کہاں سے لائے؟ یہ سوال ذہن میں گونجا تو اُس کے حوصلے پھر سے ٹوٹنے لگے۔ بہت سوچ وچار کرنے کے بعد اُس نے فیصلہ کیا کہ اس بارے میں وہ اپنے بھائی کندن سے مدد لے گا جس کا کچھ دن پہلے پھر اپنے شہر میں تبادلہ ہو گیا تھا۔ یہ بات اُس نے کندن سے کی تو وہ بولا۔''

''کیا کرو گے تم پیسے؟''

''رشوت میں دے کر اُن سے نوکری خرید لوں گا۔''

''نوکری ہی چاہئے تم کو تو میرے ساتھ چل۔ میں تمہیں گپتا جی اور نوین سے ملاتا ہوں۔ وہ تم سے جس بات کے لیے ناراض ہیں اُس بات کے لیے تم اُن سے معافی مانگ لو۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔''

اُس نے چونک کر کندن کی طرف دیکھا۔ کندن پھر بولا۔ نوکری کی تلاش تم کو بہت دنوں سے ہے لیکن آج تک تمہارے ساتھ ناکامی کے سوا کیا ہاتھ لگا ہے؟۔ میں نے تم کو اب کامیابی کا راستہ بتا دیا ہے۔ بس تمہارے چلنے کی دیر ہے۔''

''راستے تو اور بھی ہیں بھیا اور وہ سبھی راستے کامیابی کی طرف ہی جاتے ہیں اور اُن پر تم مجھے لے جا سکتے ہو۔ اس راستے پر لے جا کر کیوں میری بے عزتی کرار ہے ہو۔''

''بے عزت وہ ہو جاتے ہیں وشال جن کی کوئی عزت ہو۔''

''بھیا......؟''

''سُن لو میری بات۔ کندن فوراً بولا۔ پھر غصہ کرنا ہو تو ضرور کر لینا۔ کیا ہیں ہم؟ ایک ایماندار باپ کے دو مجبور، بے بس اور غریب بیٹے جن کا اِس سماج میں کوئی رتبہ نہیں ہے۔ میں ایک معمولی سا سرکاری ملازم اور تم بے کار؟ کیا عزت ہے ہماری جو بے عزتی ہو جائے گی۔ ہو بھی گئی تو کون دیکھے گا؟۔ کوئی دیکھے گا بھی تو کون سا ہم نے شرم سے نیل میں ڈوب کر مر جانا ہو گا؟۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو بھیا کہ ہماری کوئی عزت نہیں ہے لیکن میرے لئے یہ پھر بھی شرم سے ڈوب مرنے والی بات ہے۔'' وہ وہاں سے چل دیا کیونکہ وہ اپنے بھائی کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا۔ لیکن شام کو کندن سے اُسے اپنے کمرے میں بلایا۔ اُسے بٹھا کر بولا۔

''دیکھ تو میری باتوں کا برا نہ مانا کر۔ میں جو بھی ہوں تمہارا بھائی ہی ہوں اور کسی بھی صورت میں تمہارا برا نہ سوچوں گا اِسلئے میں نے ابھی نوین سے تمہاری نوکری کی بات کی ہے۔''

''میں نے تمہیں ایسا کرنے کو تو نہ کہا تھا بھیا۔''

''تم نے نہیں کہا تھا لیکن میں تمہارا بھائی ہوں نا؟۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں نوکری کی ضرورت ہے اِسلئے میں نے اُسکے ساتھ بات کی۔ تمہیں اب اُسے معافی مانگنے کی ضرورت بھی نہ ہو گی کیونکہ تمہاری طرف سے میں معافی مانگ چکا ہوں۔''

''بے عزتی تمہاری ہو بھیا یا میری، ایک ہی بات ہے۔''

''میں نے تمہاری بے عزتی نہ ہونے دی لیکن ایک چھوٹا سا کام کرنا ہو گا تمہیں۔''

''مجھے اُس کی کوئی شرط منظور نہ ہو گی بھیا۔''

''سُن لو میری بات پھر شرط۔ مان لو یا نہ مان لو۔ مانو گے تو تمہارا فائدہ ہو گا۔ نہ مانو گے تب بھی نوین وہ کام کر ہی لے گا کیونکہ اُس کے پاس عزت بھی ہے، دولت بھی ہے اور طاقت بھی ہے اور ان چیزوں کا استعمال کر کے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ لیکن وہ ان چیزوں کا استعمال کر کے کوئی ہنگامہ نہیں کرنا چاہتا ہے اس لیے اُس نے مجھے وعدہ دیا ہے کہ ایک مہینے

کے اندر وہ تمہیں سرکار کا ایک چھا نوکر کر دے گا۔ لیکن اُس کے بدلے تمہیں ممتا کی زندگی سے دور جانا ہوگا۔“

وشال نے چونک کر کندن کی طرف دیکھا کیونکہ اپنے سگے بھائی سے اُسے اس چیز کی اُمید نہ تھی۔ دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے لگا ابھی وہ ٹکڑے آنکھوں کے راستے نکل آئیں گے۔ بڑے بھائی سے آج پہلی بار اُس نے کچھ مانگا تھا لیکن اُس نے اُسے کچھ دیا تھا تو صرف ایک انمٹ دُکھ دیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر ٹوٹ گیا۔ واہ بھیا۔ بہت ہی بڑا کام کر رہے ہو تم۔“

”بھائی ہوں نا تمہارا۔ وہ بڑی بے شرمی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ وہ بھی سگا۔ تمہارے آنے والے دنوں کی پریشانی ہے مجھے اس لیے تمہاری دُنیا بنا رہا ہوں۔

”بہت اچھی دُنیا بنا رہے ہو تم میری۔ دلالی کر رہے ہو تم اپنے بھائی کی خوشیوں کی۔ تم جیسا آدمی تو......؟“ وہ کہتے ہوئے رُک گیا۔ آنکھوں میں پانی جمع ہوتا گیا۔ اُسی پانی کو لے کر وہ بولا۔ مجھے تو شرم آتی ہے تمہاری اس بات پر بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ تم میرے سگے نہیں بلکہ نوین کے سگے ہو۔ وہ تیزی سے وہاں سے چلدیا۔ اُسے یاد نہ تھا کہ وہ کتنی بار ٹوٹا ہے لیکن اُسے لگ رہا تھا کہ وہ جو اب ٹوٹا ہے تو بہت زیادہ ٹوٹا ہے۔ بہت دیر تک وہ اپنے ٹوٹے ہوئے وجود کو جوڑتا رہا۔ اپنی ٹوٹی ہوئی کائنات کو جوڑتا رہا۔ رات کو ماں اُس کے کمرے میں چلی آئی۔ اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کے بال سہلاتے ہوئی بولی۔

”تمہاری بھائی کے ساتھ آج تمہاری کیا بات ہو رہی تھی؟۔

”جو بات بنی نہیں وہ تمہیں سُنانے سے کیا فائدہ۔“

”ماں کے ساتھ اپنے دُکھ بانٹا کر بیٹے۔“

”دُکھ ہی بانٹ لوں، سُکھ نہیں۔“

”سُکھ جب تمہارے پاس ہوں گے تب وہ بھی بانٹ لینا۔ پیسے سے مدد مانگ رہے تھے اپنے بھائی سے۔“

”ہاں“۔

”اور اُس نے نہ دیئے۔

''تم ٹھیک سمجھی ہو ماں۔''

''تمہارا بھائی رشتے میں تمہارا بھائی ضرور ہے لیکن آج کی دُنیا میں بھائی سے بڑا رشتے دار پیسہ ہوتا ہے۔ جس سے آدمی کبھی الگ نہیں ہونا چاہتا ہے چاہئے بھائی سے الگ ہونا بھی پڑے۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو ماں۔

''تم میرے گہنے لے جاؤ۔ بازار سے اُن کے پیسے لے کر تم اپنے لیے نوکری خرید لو۔''

''نہیں ماں۔'' وہ فوراً بولا۔'' گہنے تو ہر عورت کا آخری سہارا ہوتے ہیں کوئی بیٹا اپنی ماں سے اُس کا آخری سہارا کیسے چھین سکتا ہے؟۔''

''ماں کا سہارا تو اُس کی اولاد ہوتی ہے بیٹے اور ماں کی ہر خوشی اولاد کی خوشی میں ہی ہوتی ہے۔ میرے یہ گہنے میرے کس کام کے ہیں جب میری اولاد ہی خوش نہیں ہو؟ پھر میں بیوہ اس عمر میں ان گہنوں کا کیا کروں گی؟ تم یہ لے جاؤ کیونکہ تمہیں نوکری کی سخت ضرورت ہے۔ آخر کب تمہاری آس میں کنواری بیٹھی رہے گی ممتا۔

''ممتا......؟''

''ہاں، مجھے سب کچھ پتہ چلا ہے اور ممتا مجھے پسند بھی بہت ہے۔ محلے کے ہر گھر کی طرح ممتا کے گھر میں بھی تمہاری عزت ہے لیکن تمہاری یہ بنا آمدنی والی عزت اس کے گھر والوں کو اس کی شادی کے لیے زیادہ دیر انتظار نہ کروا سکے گی اس لیے تمہیں جس بہانے، جس طریقے سے بھی نوکری ملتی ہے تم حاصل کر لو۔ اُس کے لیے تم میرے گہنے لے جاؤ اور دیکھو کہ کون سی دوکان سے ملتی ہے نوکری ۔ ہاں۔ نوکری خریدتے وقت دھیان سے نوکری کی دولہن خریدنا اور خریدنا تو ذرا خوبصورت خریدنا۔

اُس کی آنکھوں میں آنسوں بھر آئے۔ ماں پھر بولی۔ کوئی بھی آدمی پیسے سے تمہاری مدد نہ کرے گا اور پیسے کے بغیر تمہیں نوکری نہ ملے گی۔ تمہیں دیکھ کر مجھے رونا آتا ہے کیونکہ تم اپنے بڑے بھائی سے زیادہ پڑھے لکھے ہو لیکن تمہاری بدنصیبی یہ ہے کہ تم نے اُس زمانے میں جنم لیا ہے۔ جس زمانے میں انسان کی قابلیت نہ بولتی ہے بلکہ صرف پیسہ بولتا ہے۔

''پیسہ ہی بولتا ہے ماں یہ بات تم نے مجھے پہلے بتائی ہوتی تو میں نے پوری دُنیا کے

پیسے اکٹھے کر کے تمہارے قدموں میں ڈال دیئے ہوتے لیکن تم نے ہی مجھے سکھایا تھا کہ ایمانداری سب سے بڑی دولت ہے۔''

''یگ بدلا ہے بیٹے، وقت بدلا ہے۔ زمانے کا ہر طور طریقہ، ہر رواج بدلا ہے۔ وہ بات مجھے تمہارے باپ نے ہی سکھائی تھی۔ جب تک وہ زندہ تھے تب تک سب اُن کی ایمانداری کی وجہ سے اُن کی عزت کرتے تھے اور مجھے بھی اُن کی بات سچ جان پڑتی تھی لیکن اُن کے جانے کے بعد اُس ایماندار آدمی کی بے سہارا بیوہ کا یا اُن کے بے کار بیٹے کا حال تک نہ پوچھا کسی نے۔ اور پھر آج زمانہ بدل گیا ہے۔ آج جس کے پاس جتنی دولت ہے اتنی ہی اُس کی عزت بھی ہے۔ آج کے زمانے میں پیسے نہ ہوئے تو لوگ آدمی کو آدمی نہ مان لیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو ماں۔''

''ہاں اور اس لیے میرے گہنے لے جاؤ اور اُن سے اپنے لیے نوکری خرید لو۔''

''ماں''۔ وہ اپنے آنسوں پونچھتے ہوئے بولا۔ ''تم اپنے یہ گہنے رکھ لو۔ اُن کو بازار میں بیچنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ نوکری کی وہ خوبصورت دولہن خریدنے کے لیے میں اپنے آپ کو بیچنے چلا ہوں۔'' وہ گھر سے نکل کر اپنے کالج کے ساتھی چوپڑہ سے ملنے چلا کیونکہ چوپڑہ نے کالج کے بہت سے ساتھیوں کو مختلف سرکاری دفتروں میں نوکری دلوائی تھی تاکہ نوکری حاصل کرنے کے بعد اُس کے ساتھی اُن دفتروں میں اُس کی مدد کرتے رہیں۔ اس بات کی پیش کش چوپڑہ نے ایک بار وشال کو بھی کی تھی لیکن وشال موہن بابو کے ساتھ رہ کر اُن کے اصولوں کا اتنا غلام بن گیا تھا کہ چوپڑہ کی پیش کش منظور کرنا اُسے گوارہ نہ ہوا تھا۔ لیکن اب جب کہ اُن اصولوں کے دائرے میں پھنس کر اُس نے اپنی آنکھوں سے ہر طرف حق اور سچائی کو مارے جاتے ہوئے دیکھا تھا تو اُس نے فیصلہ کیا تھا کہ اب اُسے موہن بابو کے سکھائے ہوئے اصولوں کو بھول ہی جانا ہوگا ورنہ اُسے نہ ہی اُس کا حق ملے گا اور نہ ہی اُسے ممتا ملے گی۔ چوپڑہ کے گھر پر اُسے پتہ چلا کہ وہ ہنی مون کے لیے سوئزرلینڈ گیا ہے اور ابھی قریب دو مہینے تک اُس کے لوٹ آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ مایوس ہو کر گھر واپس چلا آیا کہ اسے ممتا ملی۔ اُس کا جی چاہا کہ ممتا کی بانہوں میں چھپ کر پھوٹ کر روئے

لیکن بھرے بازار میں وہ ایسا بھی نہ کر سکا۔ وہ صرف ممتا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ممتا شاید اُس کی حالت بھانپ چکی تھی۔ بولی۔

"کتنی دیر اپنی آنکھوں میں آنسوں روکے رکھو گے؟۔ تم ہمت ہارو گے تو یہ چھلک ہی جائیں گے۔

"ہاں" وہ بہت ہی جتن سے اپنے آنسوں کو روکتے ہوئے بولا۔ چھلکنے کو تو یہ مچل ہی رہیں ہیں بلکہ میں بھی ان کا چھلکانے کے لیے مچل رہا ہوں لیکن پھر تمہارے آنچل کی ضرورت ہو گی۔"

"تم نے کیسے سوچا کہ تمہاری یہ ضرورت پوری نہ ہو گی؟"

"میں بہت ڈر رہا ہوں۔"

"کیوں؟"

"مجھے لگ رہا ہے کہ مجھ سے میرا سب کچھ چھینا جائے گا اور میں .... میں مر جاؤں گا۔"

ممتا اُسکی باتوں سے بہت پریشان ہو گئی۔ اُس نے سوچا کہ نا اُمیدی موت ہے اور نا اُمیدی کو گلے لگانا موت کو گلے لگانے کے برابر ہے۔ وہ بولی۔ تمہارے ساتھ کوئی اور بھی مر جائے گا۔"

"کہ.....کون؟"

"میں لیکن ہاں تم جیو گے تو میں بھی جینے کی بات سوچوں گی۔"

"کیسے جیوں میں؟" وہ بڑی بے بسی سے بولا۔ کیا کروں؟۔ جی چاہتا ہے کہ اس بھرے بازار میں پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کروں لیکن ڈر رہا ہوں کہ لوگ مجھے پاگل کہہ ہی لیں گے تمہیں بھی دیوانی بتائیں گے کہ تم مجھ جیسے پاگل کے ساتھ ....! ممتا، زمین آسمان ایک کر دیا میں نے اپنی خوشیوں کی تلاش میں۔ میں اِس تلاش میں اتنا چلا ہوں کہ میرے پاؤں میں چھالے پڑے ہیں لیکن پھر بھی میرے ہاتھ کچھ نہ لگا ہے اور ممتا اب تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ اب میں کچھ بھی نہ کر سکوں گا بلکہ میں کچھ کرنے کے لائق ہی نہ رہا ہوں۔ میں نے جو سپنے دیکھے تھے وہ سب ریت سے بنائے گئے گھروں کی طرح تھے جو

وقت کی آندھیوں سے اب ٹوٹ کر ڈھے ہو گئے ہیں۔''

ممتا کو بہت دُکھ بھی ہوا اور پریشانی بھی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وشال کمتری کے احساس کا شکار ہو جائے۔ وہ بولی۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تم نے اپنی طرف سے بہت کوشش کی ہے لیکن تمہاری ناکامی کی وجہ صرف یہ ہے کہ تمہاری اُن کوششوں میں موہن بابو کے کھوکھلے اصولوں کی مِلاوٹ ہے۔''

''اصول تو پھر اصول ہی ہوتے ہیں ممتا لیکن موہن بابو جیسے لوگ دنیا میں بہت کم ہیں۔ اِسلئے اُن کے جیسے اصول اپنانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ یہاں وہی کرنا پڑے گا جو سب کرتے ہیں۔ آخر طوفان کا رخ دیکھ کر ہی تو کشتی موڑی جاتی ہے۔''

ممتا نے چونک کر اُسکی طرف دیکھا۔ وشال ایسی باتیں کر رہا ہے اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ موہن بابو کے اصولوں کی ممتا کو بھی قدر تھی اور اُن اصولوں کی وجہ سے وہ موہن بابو کی عزت بھی کرتی تھی لیکن موہن بابو کے اصولوں کو اپنا کر اُسے وشال کی نوکری کا سپنا دیکھنا ایک حماقت کے سِوا کچھ نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بولی۔ ''ہاں، مخالف سمت میں اپنی کشتی کا رُخ موڑنے والے اکثر ڈوب جاتے ہیں۔''

''میں ڈوبنا نہیں چاہتا ہوں۔'' وہ فوراً بولا۔ ''میں تو محفوظ ساحل تک پہنچ جانا چاہتا ہوں جہاں نہ طوفان ہو اور نہ ڈوبنے کا ڈر ہو۔''

''تم ایسا سوچنے لگے ہو تو وہ دن دور نہیں ہیں جب خوشیاں ہمارے قدموں میں ہوں گی اور میں بڑی بے خبری سے اُس دن کا انتظار کر رہی ہوں۔''

''بہت انتظار کروا رہا ہوں میں تم کو۔''

''تم اِس کی فکر نہ کرو۔ میں سب کچھ سہہ لوں گی۔ بس میرے دل میں یہ یقین بٹھائے رکھو کہ تم نے ہمت نہ ہاری ہے۔''

پوری دنیا میں وشال نے بے ایمانی، لوٹ اور رشوت کے منہ زور اور بپھرے ہوئے طوفان دیکھے تھے۔ بس ایک چھوٹا سا ٹاپو اُسے موہن بابو کی صورت میں ملا تھا۔ جو اُن طوفانوں سے آزاد تھا۔ اسی لئے بے ایمانی، لوٹ اور رشوت کے طوفانوں سے خود کو بچانے کے لئے اُس نے موہن بابو والے ٹاپو میں پناہ لی تھی۔ تاکہ وہاں رہ کر شاید اُسے اپنا حق

ملے لیکن وہاں بھی بہت دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد جب اُسے اپنا حق ملنے کی کوئی اُمید نہ دکھائی دی تو اُس نے بھی اپنی تقدیر کی کشتی کا رُخ طوفان کے رُخ میں موڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن اُس کے پاس صرف کشتی تھی، رشوت کی پتوار نہ تھی اور نہ سفارش کر کے پار لگانے والا کوئی ناخدا تھا۔ کشتی دیر تک، دور تک بہتی گئی، ہچکولے کھاتے بھی ڈوبنے لگی تو کبھی سنبھل گئی اور بس بہتی گئی۔ وہ بس دیکھتا رہا۔ طوفان کے تھپیڑے بڑی بے بسی سے سہتا رہا لیکن اُسکے ہاتھ پتوار نہ لگی اور نہ ہی اُسے کوئی ناخدا ملا۔ وہ بے بسی سے سب کچھ دیکھتا ہی رہا۔

ممتا کے گھر ممتا اور نوین کی شادی کا رشتہ دوسری بار بھی پہنچا تو دوسری بار اُن کی محبت کی عمارت کو جھٹکا لگا گو کہ عمارت ڈھے نہ ہوئی۔ گپتا جی موجودہ سرکار میں وزیر تھے۔ دور دور تک اُن کا دبدبہ تھا۔ انہوں نے نہ جانے کس غریب کا حق لوٹ کر اپنے بیٹے نوین کو ایک بڑا عہدہ دلوایا تھا جس میں آگے بھی ترقی کرنے کی بہت گنجائش تھی۔ گپتا جی اگلی بار بھی چناؤ جیت کر اُسے اور بھی آگے لے جاسکتے تھے یا پھر ہندوستانی رواج کی روایت قائم رکھتے ہوئے اُسے بھی منسٹر بنا سکتے تھے۔ ایسے رشتے تو نصیب والوں کو ہی ملتے ہیں بلکہ لوگ تو اپنی بیٹیوں کے لئے ایسے رشتے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ ممتا کے لئے خود ایسا رشتہ آیا تھا۔ اُسکے گھر والوں کو اس رشتے کو انکار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟۔ لیکن پھر بھی ممتا کی خوشی کے لئے انہوں نے اس رشتے کے لئے ہاں نہ کہی تھی۔ ممتا اُن کی اکلوتی اولاد تھی جس کی محبت کے بارے میں اُن کو پہلے ہی سب کچھ معلوم تھا۔ وہ گپتا جی کے رتبے، نوین کے عہدے اور اُن کے گھر کے عوض اپنی لاڈلی بیٹی کی خوشیوں کو مٹانا نہیں چاہتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ جب اُن کی بیٹی کا دل ہی خوش نہ ہو تو وہ سسرال کے رتبے اور دولت کا کیا کرے گی؟۔ علاوہ وشال کے لئے اُن کے ہاں بہت عزت تھی بلکہ اُن کو تو اپنی بیٹی کی پسند پر ناز تھا۔ وشال گو کہ غریب اور بے روزگار تھا لیکن ممتا کے ماں باپ کے دلوں میں اُس کا یہ نقش ضرور بسا ہوا تھا کہ وہ ایک بہت ہی اچھا محنتی اور قابل لڑکا ہے اور اُسکے ساتھ اپنی لختِ جگر کا بیاہ کرنے مین اگر اُن کو کوئی حرج تھا تو وہ یہی تھا کہ وہ برسرِ روزگار نہیں ہے۔ اُن کے خیال میں وشال کی بے روزگاری نے ہی اُس کی تمام خوبیوں کو دھبا کے رکھا ہوا ہے۔ ممتا کی ماں نے اِس بارے میں ممتا سے بات کی تو ممتا بولی۔

''تم سب کچھ تو جانتی ہو ماں۔''

''ہاں لیکن بیٹی کتنی دیر انتظار کرو گی تم؟۔ کیا پتہ کتنی دیر بعد اُسے نوکری ملے؟۔''

''ماں۔ چاند پر گرہن ہو تو کیا لوگ اُسکو خوبصورت نہیں کہتے ہیں اور کیا لوگ چاند کی خوبصورتی دیکھنے کے لئے گرہن کے ختم ہونے کا انتظار نہیں کرتے ہیں؟۔ گرہن ختم ہو جانے پر چاند کا اصل روپ نظر آتا ہے نا؟۔''

''ہاں بیٹی لیکن تمہارے اُس چاند کا گرہن ختم ہوئے صبح ہو گئی تو.......؟۔''

''تو کیا ہو گا ماں؟۔'' وہ فوراً بولی۔ ''رات تو پھر بھی آئے گی نا؟۔ چاند تو پھر چڑھے گا نا؟۔ ماں خوشی چاہے جلدی ملے یا انتظار کرنے کے بعد خوشی تو خوشی ہی ہوتی ہے اور ماں یہ خوشی مجھے جان سے بھی پیاری ہے اور اس خوشی کا انتظار کرنے سے مجھے مت روکو ماں۔ تم چاہے کہیں اور مجھے لاکھوں خوشیاں بھی دِلا دو لیکن میں تو اس خوشی کے لئے زندہ ہوں۔ یہ خوشی مجھے حاصل کرنے دو ماں۔'' اسکی پوری محبت اُسکے لہجے میں اُتر آئی تھی۔ ماں تڑپ کر بولی۔

''اس لیے تو ہم نے گپتا جی کو ہاں نہ کہی ہے ورنہ کوئی اور اتنی دیر ہرگز نہ کرتا۔''

''مجھے معلوم ہے ماں کہ تم مجھے بہت چاہتی ہو۔ میری خوشیوں کی تمہیں قدر ہے۔ مجھے تم پر اور پاپا پر بہت ناز ہے۔ میری خوشیوں کے لئے کچھ دن اور ٹھہر جاو ماں۔ میرے چاند کا گرہن ضرور ختم ہو گا۔ پھر تم دیکھنا وہ کتنا خوبصورت ہے۔'' اُس کی آنکھوں میں سپنے تھے جن کی اُس کے ماں باپ کو قدر تھی۔ ماں اُس کے سپنوں کو پورا کرنے کا فیصلہ سُنا کر ہی چلدی۔

چناؤ سامنے آرہے تھے۔ گپتا جی چناؤ کے سلسلے میں دوڑ دھوپ میں لگ گئے تو نوین کی شادی کا خیال وقتی طور پر اُن کے ذہن سے نکل گیا تو ممتا بھی اپنی جگہ سکون کی سانس لے کر بیٹھ گئی۔ اب اُس کے ذہن میں صرف یہ طلاطم تھا کہ کب وشال کو نوکری مل جاتی ہے؟ اس سلسلے میں اُس نے ایک بار انجلی ماتھر سے بھی بات کی تو اُس نے بھی اُسے یہ وعدہ دیا کہ وہ اپنے باپ سے کہہ کر وشال کے لیے ضرور کچھ کرے گی۔ چناؤ کی تیاریاں زور و شور سے ہونے لگیں۔ آج تک پورے علاقے میں کسی نے گپتا جی کے مُقابلے میں جیت جانے کی

اُمید نہ کی تھی۔ چناؤ ہوتے رہے تھے اور ہر بار گپتا جی کے مقابلے میں کھڑے اُمیدواروں کو کراری شکست ہی ہوتی رہی تھی۔ اس لیے کوئی بھی آدمی گپتا جی کے خلاف چناؤ لڑنے کو خوشی سے تیار نہ ہوتا تھا لیکن اس بار چناؤ کی ہوا کچھ دوسری تھی۔ بستی کے لوگوں کے لیے گپتا جی اب بہت پُرانے ہو گئے تھے اور پچھلے کئی سالوں سے اُن کے ہاتھوں بستی کا کچھ بھی بھلا نہ ہوا تھا۔ اس لیے لوگ چاہتے تھے کہ اس بار وہ گپتا جی کے مُقابلے میں کسی مضبوط آدمی کو کھڑا کریں اور اس بارے میں سب کی نظر موہن بابو پر تھی۔ موہن بابو نے کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا اور نہ ہی وہ اس کے لیے تیار تھے لیکن جب لوگوں نے اُن کو اس بات کے لیے بہت زور لگایا تو انہوں نے ہاں کر دی لیکن اس بارے میں ہاں کرنے سے پہلے انہوں نے وشال کو بُلا کر اُس کا مشورہ مانگا۔

"آپ جیسا مناسب جانیں" وشال بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ بولا۔ "میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" "لوگ بہت کہہ رہے ہے کہ اس بار میں چناؤ میں کھڑا ہو جاؤں لیکن تم جانتے ہو کہ میں پہلے کبھی بھی سیاست میں نہیں آیا ہوں۔ بس لوگوں کی سیوا ہی کرتا رہا ہوں۔ اب لوگ چاہتے ہیں کہ میں اسمبلی میں جا کر اُن کی بات کروں، تمہاری کیا رائے ہے؟"

"میری رائے جان کر کیا کریں گے آپ۔ اگر آپ کو یقین ہے کہ اسمبلی میں جا کر آپ لوگوں کی بات کر سکیں گے تو پھر ٹھیک ہے۔

"یہ تم میرے اُوپر چھوڑ دو۔ تم صرف میری جیت کا اندازہ لگا کر مجھے بتاؤ۔"

"جو سچائی کی بات کرنا چاہتے ہوں بابو جی وہ ہار جیت سے نہیں ڈرتے ہیں۔ آپ کی جیت ہو گی تو لوگوں کی جیت ہو گی آپ کی ہار ہوئی تو بھی یہ فائدہ ضرور ہو گا کہ مخالف اُمیدوار بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گا کہ کوئی آواز اُس کے خلاف اُٹھ گئی ہے اور اگلے چناؤ میں ووٹ حاصل کرنے کے لیے وہ کوئی تو اچھا کام ضرور کرے گا۔"

"تمہاری بات ٹھیک ہے وشال لیکن اس چناؤ میں، میں ہار گیا۔ تو میری چناؤ مُہم میں شامل لوگ اور میرے حق میں ووٹ ڈالنے والے لوگ گپتا جی کی نظروں سے گر جائیں گے اور چناؤ جیت جانے کے بعد گپتا جی شاید اُن سے بدلہ لیں گے جو میں کسی بھی

صورت میں نہیں چاہوں گا اور ہاں اس چناؤ میں، میں جیت گیا تو تم سے میرا وعدہ رہا کہ میں دوست اور دشمن میں سے کسی کا بھی حق نہ لُٹ جانے دوں گا۔ میں اپنے لوگوں کو بڑے بڑے کام کرانے کے وعدے تو نہ دوں گا لیکن حق اور سچائی کی حفاظت کا وعدہ میں اُن کا ضرور دوں گا۔"

"یہی تو میں بھی چاہتا ہوں بابو جی۔" وشال فوراً بولا۔ بلکہ اس علاقے کا ہر آدمی یہی چاہتا ہے کہ اسمبلی میں جا کر ہر آدمی حق اور سچائی کی بات کرے۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" موہن بابو فوراً بولے۔ سب لوگوں نے مل کر مجھے یہ چناؤ لڑنے کا مشورہ دیا ہے اور میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ ہمارے ہاں اپنا ہر لیڈر اپنا اپنا گھر بھرنے کی دوڑ میں لگا ہوا ہے۔ ہمارے ہاں لوگوں کے حق کی رکھوالی کرنے والا کوئی نہیں رہا ہے۔ اب لوگ زور دے رہے ہیں تو میں سوچ رہا ہوں کہ اُن کے حقوق کی رکھوالی میں کروں گا۔"

وشال، موہن بابو کے خیالات سے بہت خوش ہوا تو اُس نے موہن بابو کو یقین دلایا کہ وہ اپنے سارے دوستوں کو ساتھ ملا کر گھر گھر جائے گا اور اُن کے لیے ووٹ حاصل کرے گا۔ وشال کی یقین دہانی پاتے ہی موہن بابو نے چناؤ لڑنے کے لیے ہاں کہہ دی۔ بستی میں نہیں بلکہ پورے علاقے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ گپتا جی بھی موہن بابو کے اثر و رُسوخ سے واقف تھے۔ اس لیے اُن کو اپنی گدی ڈولتی ہوئی محسوس ہوئی چنانچہ انہوں نے فوراً ہی اپنے ایک خاص آدمی سے وشال کو اپنے گھر بُلایا۔ وشال نہ جانا چاہتا تھا لیکن ممتا کے سمجھانے پر وہ اُن سے ملنے کے لیے چلدیا۔ گپتا جی نے اُسے اپنے سامنے بٹھا دیا اور دیر تک اُسے اس چناؤ کے بارے میں کہتے رہے۔ وشال بھی اُن کی باتیں غور سے سُنتا رہا۔ وہ بولے۔

"اس بار میں چناؤ جیت گیا تو شاید میں ریاست کا وزیرِ اعلیٰ بھی بن جاؤں۔ سوچو کہ اگر میں وزیرِ اعلیٰ بن گیا تو میں اپنے علاقے کے لیے کیا کچھ کر سکتا ہوں۔

"جی"۔

"دیکھو نا۔ ساری طاقت میری ہاتھ میں ہوگی۔ میں اُس وقت طاقت کا استعمال کر کے اس علاقے کو جنت بنا لوں گا۔"

''جی۔''

''اسی لیے میں نے تم کو یہاں بُلایا ہے۔ تم اس علاقے کے سب سے اچھے نوجوان ہو۔ تمہارے کہنے سے مجھے سب ووٹ دیں گے اور چناؤ جیت جانے کے بعد میں تمہارے لیے ضرور کچھ کروں گا۔''

وہ خاموشی سے گپتاجی کی باتیں سُنتا رہا۔ دراصل وہ من ہی من ہی اس بات کا جائزہ لیتا رہا کہ عوام کے ووٹ کی کتنی قیمت ہے؟۔ بڑے بڑے لوگ بھی چناؤ کے دوران چھوٹے چھوٹے لوگوں کو اپنے ساتھ بٹھا کر اُن سے التجا کر سکتے ہیں۔ وہ بولا۔ میں تو ایک معمولی سا آدمی ہوں اس لیے مجھے یہاں بُلانے سے اور اتنی باتیں سُنانے سے اچھا تھا کہ آپ موہن بابو سے ملتے۔ دراصل صرف اس بستی کے نہیں بلکہ پورے علاقے کے لوگ اُن کو چناؤ لڑنے پر زور دے رہے ہیں۔ اگر وہ چناؤ لڑنے کا خیال چھوڑ دیں تو آپ کی جیت یقینی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ میں اُس کے پیر پکڑوں؟ گپتاجی غُصے سے بولے۔ میں اُسے ملنے اس کے گھر جاؤں؟''

''آپ......آپ اُن کو یہاں بھی بُلا سکتے ہیں۔''

''ہرگز نہیں۔'' وہ فوراً بولے۔ میں نے تم کو صرف اس لیے بُلایا تھا کہ تم اس کے داہنے ہاتھ کی طرح ہو۔ تمہیں اپنے ساتھ ملا کر میں اُن کا داہنا ہاتھ کاٹنا چاہتا تھا لیکن تم تو مجھے اُلٹے مشورے دینے لگے۔''

''میں نے ایسی تو کوئی بات نہ کی تھی۔''

''تم نے جو کچھ بھی کہا ہے اُس سے مجھے بہت چوٹ پہنچی ہے لیکن تم بھی کبھی سُکھ نہ پاؤ گے بلکہ میں تمہیں سُکھ پانے نہ دوں گا۔ تم اس چناؤ مہم میں شامل ہوئے تو میں تمہیں اپنے راستے سے دوسرے طریقوں سے بھی ہٹا سکتا ہوں اور اس بوڑھی عمر میں رات دن روتی رہے گی تمہاری ماں۔''

''گپتاجی'' وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ میری ماں نہ روئے گی کیونکہ میں زندہ رہوں گا لیکن آپ نے میرے راستے میں آنے کو کوشش کی تو پھر آپ کا مقابلہ موہن بابو سے نہیں

بلکہ مجھ سے ہوگا۔ بوڑھی عمر میں رات دن روتے رہیں گے آپ اپنی کھوئی ہوئی کرسی کے لیے۔'' وشال تیزی سے اُن کے گھر سے نکل گیا۔

''موہن بابو اپنی شرافت اور اپنے اصولوں سے دور دور تک ہر دل عزیز تھے اور دُنیا میں شاید ہی ایسا کوئی آدمی ہوگا جس کے ساتھ اُن کے رشتے ٹھیک نہ ہوں۔ انہوں نے سماج کے ہر طبقے، ہر ذات اور ہر ملت کے لوگوں کے ساتھ یکساں محبت کی تھی۔ لوگ شروع سے ہی اُن کو کامیاب بنانے کے لیے تیار تھے۔ وشال اور اُس کے دوستوں نے بھی چناؤ کے پرچار کے لیے رات دن ایک کردیئے۔ موہن بابو کے خیرخواہوں میں سے ایک شودت بھی تھا جس کے ساتھ وشال کی پہچان چناؤ مہم کے دوران ہی ہوگئی۔ چھ فٹ سے بھی لمبا، موٹا، تازہ وہ نوجوان موہن بابو کو اس چناؤ میں کسی بھی قیمت پر کامیاب دیکھنا چاہتا تھا۔ وشال سے بولا۔

''آپ کی کیا رائے ہے؟۔ اس چناؤ میں کون جیت جائے گا۔''

''دیکھو کیا نتیجہ نکل آتا ہے، ابھی تک تو مقابلے کی ٹکر ہے۔''

''اس بار میں نے موہن بابو کو کامیاب کرانا ہے۔ ہر قیمت پر کامیاب کرانا ہے۔

''ہم بھی یہی چاہتے ہیں شودت لیکن گپتا جی بھی اپنی کامیابی کے لیے پورا زور لگا رہے ہیں۔

''مجھے معلوم ہے لیکن وہ کچھ بھی کریں اس بار اُن کو ہار ہی جانا ہے، چاہئے اس کے لیے ہمیں علاقے کے سارے ہی پولنگ بوتھوں پر قبضہ کرنا پڑے۔

''لیکن اُن کے آدمی بھی ایسا ہی سوچیں تو؟''

''تو پھر طاقت دیکھی جائے گی۔ وہ اپنے جوان، مضبوط اور تنومند بازو سب کو دکھاتے ہوئے بولا۔ فولاد ہیں یہ میرے بازو۔ جانتے ہوں مجھ میں اتنی طاقت کیسے آئی ہے۔

''کیسے۔

میں نے صرف دس سال کی عمر سے کمانا شروع کیا ہے۔ زمانے کی دھوپ سہہ سہہ کر میرا جسم فولاد ہوگیا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہی دیکھتے خون اُتر گیا۔ بولا۔ یہ سب اُسی گپتے کی وجہ سے ہوا تھا۔ اُس نے میرے باپ کا خون کیا تھا۔ اُسی نے مجھ سے میرا

بچپن چھین لیا تھا۔ آج مجھے اُس سے بدلہ لینے کا موقعہ ملا ہے، ہر حساب لینے کا موقعہ ملا ہے اور میں اُسے ہر وا کر ہی رہوں گا۔"

شودت کی آنکھوں میں خون تھا اور اُس خون میں جوش تھا۔ وہ وشال اور اُس کے دوستوں کے مل کر موہن بابو کا چناؤ پرچار کرنے لگا۔ وشال کو بھی شودت کے ساتھ کام کرنا اچھا لگ رہا تھا کیونکہ وہ بہت اچھا آدمی تھا۔ پورا دن وشال کے ساتھ گزارنے کے بعد رات کو وہ ضرور گھر جاتا تھا کیونکہ اُسے اپنے بچے اور اپنی بیوی سے بہت پیار تھا اور اُن کا خیال رکھنا وہ اپنا پہلا فرض جانتا تھا۔

"میں میری بیوی سے بہت پیار کرتا ہوں اور میرے بچے سے بھی۔" وہ بولا۔ "وہ بھی میرے ساتھ پیار کرتے ہیں۔"

"میاں بیوی اور بچے ہر گھر میں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ وشال نے کہا۔"

"کرتے ہوں گے وشال بابو۔" وہ فوراً بولا۔ لیکن ہماری بات ہی اور ہے۔ ہم بہت بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ میں جب دس سال کی عمر میں یتیم ہو کر اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھانے لگا تب ہی مجھے ملی تھی اور تب سے ہم برابر ساتھ رہ رہے ہیں۔ شادی صرف تین سال پہلے کی ہے۔ انورادھا کے ساتھ۔"

"اُس کے ماں باپ۔"

"باپ کا اُسے پتہ نہیں لیکن کہتی ہے کہ اُس کی ماں بہت خوبصورت تھی اور......؟ جانے کس بڑے آدمی کی اولاد ہے وہ؟۔ کہتی ہے کہ وہ اپنے باپ کو صرف ایک بار دیکھ سکی ہے۔ وہ بھی تب جب اُس نے اُس کی ماں کا خون کیا تھا۔"

"وہ اُسے پہچان سکے گی۔"

"ہاں کیونکہ وہ اب بھی اُس کا حلیہ بتاتی ہے۔ حلیے سے وہ گپتا جی ہی ہیں۔"

"اوہ نو......؟"

"ہاں" دور ایک گاؤں کی ہے وہ۔ اُس کے پتا وہاں گئے تھے کسی دوست سے ملنے اور پھر انہوں نے مندر میں شادی کر لی وہاں چند ایک دن ٹھہر کر یہ کہہ کر چلے کہ وہ بہت جلد واپس آئیں گے لیکن بہت دیر تک جب نہ آئے تو انورادھا کی ماں کی تشویش بڑھ گئی کیونکہ

وہ ماں بننے والی تھی ۔ اپنے مرد کی تلاش میں شہر شہر گھومی ۔ انورادھا کو بھی جنم دیا۔ محنت مزدوری کر کے اُسے پالا۔ ٹھیک آٹھ سال کی تلاش کے بعد اُسے اپنا مرد ملا۔ سوچا کہ اب دُکھوں کے دن بیت گئے ہیں لیکن اُس ظالم نے چاقو کا پورا پھل اُس کی پیٹ میں اُتار کر اُسے مار ڈالا اور پھر انورادھا کا خون کرنے کی غرض سے اُس کے پیچھے دوڑا لیکن وہ وہاں سے بھاگ نکلی۔ رات کو پھر اُس جگہ پہنچی جس جگہ اُس کی ماں کا قتل ہوا تھا لیکن وہاں ماں کی لاش نہ ملی اُسے۔ ایک پارک میں گھس کر ایک بینچ پر بیٹھ کر رونے لگی۔ وہیں پاس میں، میں بھی بیٹھا تھا۔ مجھ سے اُس کے آنسوں نہ دیکھے گئے۔ ہم دونوں بے سُہارا تھے اس لیے ایک دوسرے میں ہمیں ایک دوسرے کا سُہارا نظر آیا۔ تب سے آج تک کی زندگی ہم نے ایک ساتھ گزاری ہے۔ محنت مزدوری ایک ساتھ کی۔ ایک ہی جھونپڑی میں رہے لیکن اپنے ان انسانی اور بے لوث رشتوں کو کبھی داغدار نہ ہونے دیا۔ تین سال پہلے شادی کی۔ آج وہ اپنے اور میرے بچے کی دیکھ بال کرتی ہے اور میں ہم تینوں کے لیے کماتا ہوں۔ خوش ہیں ہم لیکن دُکھی بھی ہے میں اس لیے دُکھی ہوں کہ میں اپنے باپ کے قاتل کو آج تک سزا نہ دے سکا ہوں اور وہ اس لیے دُکھی ہے کہ اُسے اپنا وہ باپ کہیں نہیں مل رہا ہے جس نے اُس کی ماں کا قتل کیا ہے۔''

''مان لو کہ کل وہ اپنے باپ کو کسی موڑ پر اچانک دیکھتی ہے تو......؟''

''قتل کرے گی وہ اُسے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ وہ کبھی گپتا جی کے سامنے نہ آئے۔ وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہو گئے تو میری زندگی کا چین اُڑ جائے گا۔

''تم دونوں کی بات واقعی اور ہے۔''

''ہے نا؟'' اور اب میں چاہتا ہوں کہ گپتا جی یہ چناؤ ہار جائیں۔ اُن کی طاقت کم ہو جائے گی تو میں اپنا بدلہ لے لوں اور پھر انورادھا سے بھی کہہ دوں کہ دیکھ انورادھا تمہاری ماں کا قاتل کس حال کو پہنچا ہے۔''

''قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لینا شودت۔''

''واہ!'' شودت طنز کرتے ہوئے بولا۔ یہی بات تم گپتا جی سے کہہ سکتے ہو۔''

وشال نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ فوراً بولا۔'' ہم لوگ بے بس ہیں کہ ایک

دوسرے کو یہ مشورہ دیتے رہتے ہیں کہ قانون کو ہاتھ میں نہ لینا چاہئے اور آئے دن قانون توڑنے والوں کو کچھ بھی نہیں کہہ پاتے ہیں۔"

"اُن کو ہم یہ سب باتیں نہیں کہہ سکتے ہیں" وشال اُسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ "ہاں اُن کو ہم چناؤ میں ووٹ نہ دے کر یہ احساس دلا سکتے ہیں کہ اُن کی ناانصافیاں کس کو قبول نہیں ہے۔"

"اسی لیے تو میں اِس چناؤ مہم میں اُترا ہوں۔"

"اور یقین جانو کہ ہم اس میں کامیاب ہو نکلیں گے۔ وشال نے اُسے حوصلہ دیا۔"

چناؤ مہم بہت تیز ہو گئی۔ دونوں طرف جلسے ہونے لگے اور جلسوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ لوگوں کا جھکاؤ موہن بابو کی طرف ہے۔ گپتا جی کی پریشانی بڑھ گئی۔ وہ موہن بابو کے کامیاب جلسوں کے لیے صرف وشال اور شودت کو ذمہ دار ماننے لگا۔ انہوں نے بڑی اُمید سے نوین کی طرف دیکھا۔ وہ بھی نا اُمید سا لگ رہا تھا۔ گپتا جی بولے۔

"وہ تمہارا ہم کلاس، تمہارا دوست بھی رہا ہے۔ اُسے کسی بھی طرح وہاں سے توڑ کے لاؤ۔"

"پتا جی۔" نوین کچھ سوچ کر بولا۔ "موہن بابو کے کھوکھلے اصولوں کی زنگ اُس کے ذہن پر چڑھی ہوئی ہے اس لیے اُسے کوئی بھی لالچ دے کر وہاں سے نہیں لایا جا سکتا ہے لیکن آپ فکر نہ کریں، میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال لوں گا۔"

نوین نے اپنی کئی دوستوں سے کہہ کر وشال کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی لیکن وشال بک نہ سکا۔ نوین نے شودت کو بھی خریدنے کی کوشش کی لیکن وہ اُسے بھی خرید نہ سکا اس لیے اس نے اُن دونوں کو ختم کرنے کا منصوبہ بنا ڈالا۔ رات کو وشال موہن بابو کے گھر سے اپنے گھر کی طرف آ رہا تھا کہ کئی لوگوں نے اُس پر حملہ کیا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ یہ سب گپتا جی اور نوین کے لوگ ہیں۔ وہ چونکہ اکیلا تھا اس لیے اپنا بچاؤ کرنے کے ساتھ ساتھ وہ وہاں سے فرار ہو گیا لیکن نوین کے آدمی اس کے تعاقب میں لگے رہے یہاں تک وہ اپنے محلے سے باہر نکل آیا اور پھر بھی وہ لوگ اس کے پیچھے لگے رہے۔ بہت دیر بھاگتے رہنے کے بعد

بھی جب اُسے بچنے کی کوئی اُمید نظر نہیں آئی تو وہ تعاقب کرنے والوں سے نظریں بچا کر پلک جھپکنے میں ایک گھر میں داخل ہوا۔ اُس نے فوراً ہی دروازہ اندر سے بند کیا اور دروازے کے ساتھ ہی کھڑا ہو کر اپنی سانسیں دُرست کرنے لگا۔ اپنی حالت سنبھالنے کے بعد وہ گھر کا جائزہ لینے لگا لیکن تبھی وہ چونک گیا۔ سامنے ادھیڑ عمر کا ایک پُر وقار اور تنومند آدمی ریوالور سے اُس کا نشانہ باندھے کھڑا تھا۔ وہ بولے۔''

''تم جو بھی ہو، جو بھی جُرم ہے تمہارا وہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ ابھی تم اپنے ہاتھ اوپر کرو۔''

وشال نے فوراً ہی اپنے ہاتھ اوپر کیے۔ اُس کے زخمی ہاتھ سے بہتا ہوا خون دھیرے دھیرے اُس کی کہنی سے گرتا ہوا فرش گندھا کرنے لگا۔ وہ بولا۔ آپ جو بھی ہیں مجھے مجرم نہیں کہہ سکتے ہیں۔''

''واہ نوجوان۔'' تم تو وکیلوں کی طرح باتیں کرنے لگے۔''

''وکیل نہیں ہوں لیکن تھوڑے بہت قانون جانتا ہوں۔''

''ایک قانون یہ بھی ہے کہ کسی کے گھر میں بغیر اجازت چوری چھپے نہیں گھسا جاسکتا ہے۔''

''لگتا ہے کہ قانون آپ بھی بہت جانتے ہیں لیکن میں چوری یا ڈاکے کی نیت سے گھر میں داخل نہیں ہوا ہوں۔'' ہاں گھر میں بغیر اجازت داخل ہونے پر میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں اس کے لیے مجبور تھا۔''

''تمہارے اس بہتے ہوئے خون کو میں کیا سمجھوں۔''

وشال نے اپنی کہنی سے گرتے ہوئے خون کی طرف دیکھا۔ بولا۔'' خون کو خون ہی سمجھیے لیکن اس کے بہاؤ کو غنڈہ گردی کا نتیجہ سمجھیے جو چناؤ مہم میں گپتا جی نے اپنا ہتھیار بنایا ہوا ہے۔

''تو تم موہن بابو کے آدمی ہو؟''

''نہیں۔ میں سچائی کا آدمی ہوں۔''

''بہت خوب۔'' وہ ریوالور کو جیب میں ڈالتے ہوئے بولے۔''میں یہاں کا پولیس کمشنر او۔ پی۔ ماتھر ہوں۔ اپنے ہاتھ نیچے کرلو۔ ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' انجلی''۔ انہوں نے مُڑ کر آواز لگا دی تو تھوڑی دیر میں ہی انجلی چلی آئی۔ وشال کو سامنے دیکھ کر بولی۔''

''ہیلو وشال۔ تم کیسے آئے ہو لیکن تم تو زخمی ہو گئے ہو؟ تم بیٹھو، میں تمہاری پٹی کرتی ہوں۔'' وشال کو بٹھا کر وہ اُس کی پٹی کرتے ہوئے اپنے باپ سے بولی۔''میں آپ کو ان سے ملانا ہی بھول گئی پتا جی۔؟''

''تو اب ملاؤ۔''

''یہ وشال ہیں۔ میرے کلاس فیلو۔ ہمارے کالج میں ان کو سب پیار کرتے تھے۔ بہت Intelligent تھے یہ لیکن......؟ وہ ایک دم اُداس ہو کر بولی۔ بد نصیبی دیکھئے۔ آپ کی یہ بیٹی ڈاکٹر ہو گئی اور یہ ایم۔ اے کی ڈگری لے کر اب تک بے روزگار ہیں۔''

''نہیں بیٹی''۔ ماتھر صاحب فوراً بولے، یہ تو لیڈر ہو گئے ہیں۔''

وشال نے چونک کر اُن کی دیکھا بولا۔ آپ شاید مجھے غلط سمجھے ہیں۔''

''جو بھی ہے۔ میں تم کو یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ ان لیڈر لوگوں کے پیچھے جا کر اپنی زندگی خراب نہ کرو۔ یہ صرف چناؤ کے دوران ہی لوگوں کے دوست ہوتے ہیں۔ تمہارے موہن بابو جیت جائیں گے یا گپتا جی۔ جیت جانے کے بعد کامیاب اُمیدوار اپنے وفاداروں کو بھول جائے گا اس لیے یہ خون خرابہ مت کرو۔ یہ خون خرابہ کرنے سے کچھ نہیں ملے گا۔ نہ غریب کو روٹی ملے گی اور نہ بے روزگار کو روزگار۔

''موہن بابو کے بارے میں بھی آپ کی یہی رائے ہے۔''

''بے شک۔'' وہ فوراً بولے۔ اور تم دیکھنا میرا کہا بالکل سچ ثابت ہوگا۔ ہاں کیا گپتا جی کے لوگوں نے تم پر حملہ کیا تھا۔''

''جی''۔

''شکر ہے کہ تم بچ گئے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ موہن بابو کے ایک وفادار شودت کا خون کر چکے ہیں۔''

''نہیں۔'' وہ تڑپ اُٹھا۔

''ہاں۔ ابھی کچھ دیر پہلے مجھے اطلاع ملی ہے۔ تم کیا جانتے ہو شودت کے بارے میں؟''

''آپ کیا جاننا چاہتے ہیں؟''۔

''یہ کہ موہن بابو کے ساتھ کیوں جڑا تھا؟''۔

''کیونکہ اُسکے بچپن میں گپتا جی نے اُسکے باپ کا قتل کیا تھا۔''

''یہ تم سے کس نے کہا ہے؟''۔

''شودت نے......؟''۔

''افسوس کہ اس نے مجھ سے نہ کہا۔''

''قانون پر اور پولیس پر اُس کو یقین نہیں تھا۔''

''یہ بھی لوگوں کی غلطی ہی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ سارا کام پولیس ہی کرے۔''

''کام تو ویسے پولیس کا ہی ہے۔''

''ہے، لیکن گواہی دینے کے لیے سامنے آنا لوگوں کا کام ہے۔''

''لوگ گواہی دینے سے ڈرتے ہیں کیونکہ عدالتوں میں کافی وقت لگ جاتا ہے اور کبھی کبھی تو گواہ کو بھی جان کا خطرہ ہو جاتا ہے۔''

''پتا جی۔'' انجلی بول پڑی۔ ''آپ کہاں کس بحث میں پڑھ گئے؟۔ اِس سے اچھا تو یہ ہے وشال کے لیے آپ کہیں کسی نوکری کا بندوبست کریں۔ یہ بہت ہی اچھا آدمی ہے، بس ذرا سا بدنصیب ہے۔''

''بدنصیبی کسی نوکری کو حاصل کرنے میں دیوار بن کے نہیں آسکتی ہے بیٹی۔ ہمت ہو تو آدمی اپنے بل پر بھی نوکری حاصل کر سکتا ہے۔ وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلدیئے تو انجلی وشال سے بولی۔

''تم فکر نہ کرو۔ میں پتا جی سے پھر بات کروں گی۔''

کوئی فائدہ نہیں ہے انجلی۔ اُن کا مطلب میں جان گیا ہوں۔ وہ جلدی چلدیئے ورنہ میں اُن سے ضرور پوچھ لیتا کہ کیا اُن کی بیٹی صرف اپنے بل پر ڈاکٹر بنی ہے۔؟۔ وہ تیزی

سے وہاں سے نکل گیا۔شودت کی موت کا غم اُسے بہت ستا رہا تھا۔ابھی شام سے پہلے تک وہ دونوں ایک ساتھ تھے۔اُس نے سوچا کہ اس کی پیاری بیوی اور اُس کا معصوم بچہ اُس کی راہ دیکھ رہا ہوگا۔وہ ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں لیکن اب......؟ وہ رو پڑا۔سوچا کہ اُسے یہ خبر جا کر موہن بابو کو دینی چاہئے لیکن رات ہو رہی تھی اس لیے اُس نے زیادہ خطرہ اُٹھانا مناسب نہ جانا۔وہ اپنے گھر چل دیا جہاں اُس نے اپنے بڑے بھائی کندن کو بہت غُصے میں پایا۔

''وشال'' وہ بہت ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔تم جو کر رہے ہو اُس سے تم نہ صرف اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہے ہو بلکہ مجھے بھی بُرباد کر رہے ہو۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا بھیّا۔''

موہن بابو کا ساتھ دے کر تم نے گپتا جی اور نوین سے دشمنی مول رہے ہو اور تمہاری اس دشمنی میں، میں بھی مارا جاؤں گا۔

''میں نے تو اُن سے کوئی دشمنی نہیں کی ہے بھیا اور اگر پھر بھی وہ دشمنی پر اُترے ہیں تو میرے ساتھ کریں گے، تمہارے ساتھ وہ کیوں کچھ کریں گے؟۔''

''اس لیے کہ بدنصیبی سے میں تمہارا بھائی ہوں۔''

وشال نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔شودت کی موت کی خبر سُن کر اُس کے دل کے بہت ٹکڑے ہو گئے تھے اور اپنے بھائی کی اس بات سے اُس کے دل کے ٹکڑوں کے ٹکڑے ہو گئے۔اُس کا بھائی اُس کے ساتھ اپنے خون کے رشتے کو بھی بدنصیبی کا نام دے گا اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔اُسے بہت دُکھ ہوا۔بولا۔بھیا میں تو موہن بابو کی چناؤ مہم میں حصہ لینا نہ چھوڑ دوں گا۔تم جا کر گپتا جی اور نوین سے کہہ دینا کہ تمہارے بھائی نے تمہاری بات نہ مانی ہے۔وہ چلنے لگا۔پھر ایک دم رُک کے بولا۔''ہاں بھیا، ضرورت ہوئی تو اُن سے یہ بھی کہہ دینا کہ میں بہت سر پھیرا ہو گیا ہوں اور میں اپنے پتا سمان بڑے بھائی کی بات نہیں مانتا ہوں اس لیے تم نے میرے ساتھ ہر تعلق توڑا ہے۔ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تعلق ہے۔'' وہ زور دیتے ہوئے بولا۔تعلق ہے کیونکہ تم میرے بھائی ہو۔''

''اس کو تم اپنی بدنصیبی مانتے ہو۔''

"ہاں" اس لیے کہ اس تعلق کو میں اپنی بدنصیبی مانتا ہوں۔ وہ اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "کیونکہ تم یہ نہیں جانتے ہو کہ گپتا جی اور نوین کے میرے اوپر کتنے احسان ہیں اور دیکھو تو، میں اُن کے احسانوں کا کیا بدلہ دے رہا ہوں؟ اپنے سگے بھائی کے ہاتھوں اُن کی ہار کا پیغام؟۔ میرا ہی بھائی اُن کے خلاف لوگوں کے کان بھر رہا ہے۔ یہ میری بدنصیبی نہیں ہے تو کیا ہے؟ مجھے انہوں نے نوکری دلوا دی۔ اب میری نوکری میں انہوں نے کچھ دنوں میں ترقی کرانے کا جو وعدہ کیا ہے اب وہ بھی پورا نہ ہوگا اس لیے اچھا ہے کہ ہم الگ ہو جائیں۔"

پہلے وشال کو اپنے بھائی کی باتوں پر صرف دُکھ ہوا تھا اب اُسے غصہ بھی آیا تھا۔ وہ بولا۔ "الگ تو ویسے بھی تم ہو گئے ہو۔ اب اور کس طرح سے الگ ہونا ہے؟"

"میں ہر ایک چیز کا بٹوارہ کروں گا۔"

"گپتا جی کے لیے۔"

"ہاں گپتا جی کے لیے، نوین کے لیے اور اپنے لیے۔"

وشال تھوڑی دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ پہلے تم نوین کے کہنے پر اپنے بھائی سے اُس کی خوشیوں کی دلالی کرنے لگے تھے۔ اب تم اُسی نوین کے کہنے پر اپنے بھائی کو اپنے سے الگ کر رہے ہو۔ تم کچھ بھی کرو بھیا لیکن میں اُس آدمی کے لیے کام کرنا بند نہ کروں گا جو ہمارے حقوق کی رکھوالی کے لیے میدان میں اُترا ہے۔ وشال وہاں سے نکل گیا تو کندن نے موقعہ غنیمت جان کر اپنا حصہ الگ کر دیا۔ اُس دن وشال ماں کی گود میں سر چھپا کر بہت دیر تک روتا رہا۔ ماں نے بڑے پیار سے اُسے سہلایا۔ اُس کے آنسوں پونچھے۔ اس کی ہمت باندھی۔

"بٹوارہ ہو رہا ہے ماں۔ وہ بڑی مشکل سے بولا۔"

"یہی ہوتا ہے بیٹے۔ تم کیوں رو رہے ہو؟"

"وہ میرا بھائی نہیں ہے کیا؟"

"ہاں، ہے تو"۔

"پھر......؟"

''دُنیا کی یہی ریت ہے بیٹے۔'' ماں بھی جذباتی ہوگئی تھی۔ ایسا ہر گھر میں ہوتا ہے۔''

''کیا ہر گھر میں ہر چیز بٹ جاتی ہے ماں؟''۔

''ہاں بیٹے۔

''کیا محبت بھی بٹ جاتی ہے؟''۔

''محبت تو محبت ہے بیٹے۔ وہ کیسے بٹ سکتی ہے؟''۔

''بٹ رہی ہے ماں۔ وہ دیکھو۔ وہ گھر کی ہر چیز لے جاتے ہوئے یہ تو نہیں کہہ رہا ہے کہ ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے؟''۔

''وہ جو بھی لے جاتا ہے بیٹے، اُسے لے جانے دو۔ تم پھر خرید لینا۔

''ماں۔'' وہ ماں کی گود میں اور زیادہ چھپ کے بولا ''وہ تمہیں بھی لے گیا تو میں تمہیں کہاں سے خرید لوں گا؟''۔

ماں کی آنکھوں سے آنسوں بہہ نکلے۔ بیٹے کی بے بسی اور محبت دیکھ کر وہ بہت جذباتی ہو کر بولی۔ ''وہ مجھے نہیں لے جائے گا بیٹے کیونکہ میں اُسکے کسی کام کی نہیں ہوں۔ وہ تو خوشی سے مجھے تمہارے لئے چھوڑ دے گا۔''

وشال نے اپنی نم ناک آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھا۔ بولا۔ ''پھر چاہے وہ جو بھی لے جائے، مجھے غم نہ ہوگا۔''

ماں نے اُسے اپنی بانہوں میں چھپا دیا۔ دراصل کندن دونوں کے لیے یکسان تھا۔ دونوں کو اُس نے برابر چوٹ پہنچائی تھی۔ کندن سے جو کچھ بھی ہو سکا وہ لے گیا۔ گویا بٹوارہ نہ ہوا لوٹ ہوگئی۔ وشال نے اُسے کسی چیز کے لیے منع نہ کیا۔ ماں نے بھی اُسے کسی چیز کے لیے نہ روکا۔ گھر کے دو گھر ہو گئے تھے۔ گویا جگر کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ وشال کے گھر میں بہت سارا ضروری سامان کم ہو گیا تھا لیکن اُسے غم نہ تھا کیونکہ اُس کے ساتھ ماں تھی جسے وہ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پیار کرتا تھا۔ وہ مطمئن تھا۔

شودت کی موت سے موہن بابو کے حوصلے ٹوٹ گئے تھے۔ لیکن وشال اور اُس کے دوستوں نے پھر سے موہن بابو کی ہمت باندھ لی اور وہ پھر سے چناؤ مہم میں حصہ لینے لگے۔ موہن بابو نے وشال اور اُس کے دوستوں کو شودت کے گھر جا کر اُس کی بیوی سے ملنے اور

افسوس ظاہر کرنے کے لیے سختی سے منع کیا۔

"لیکن کیوں؟۔" وشال نے پوچھا۔ آپ ہمیں وہاں جانے سے منع کیوں کر رہے ہیں؟"

کیونکہ پولیس کو قاتل کی تلاش ہے اور میں نہیں چاہتا ہوں کہ تم لوگ کسی مصیبت میں پڑھ جاؤ۔ یہ وقت ہم سب کے لیے بہت نازک ہے۔ چناؤ کے بعد ہم سب شودت کے گھر جائیں گے۔

چناؤ ہو گئے اور گپتا جی کے مقابلے میں موہن بابو بھاری اکثریت سے جیت گئے۔ چناؤ حلقے کی پوری بستیوں میں موہن بابو کے حامیوں نے اُن کی جیت کی خوشی میں جشن منائے اور موہن بابو کی اپنی بستی سے اس خوشی کے سلسلے میں ایک بہت بڑا جلوس نکلا اور وہ جلوس فتح کی خوشی میں طرح طرح کے نعرے لگاتا ہوا بستی کے ہر بازار، ہر گلی میں گیا اور جب وہ جلوس گپتا جی کے گھر کے سامنے پہنچا تب نہ جانے کس نے کیا شرارت کی؟ ایک پتھر گپتا جی کے گھر میں لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہنگامہ ہو گیا۔ گپتا جی کے گھر میں بھی اُن کے کچھ خاص لوگ موجود تھے۔ انہوں نے جو مزاحمت کی تو دونوں طرف کے لوگوں میں سیدھی ٹکر ہو گئی۔ وشال ذرا پیچھے تھا۔ آگے ہنگامہ دیکھ کر وہ دوڑتا ہوا چلا آیا اور پھر اُس کی کوششوں سے ہی موہن بابو کے جلوس میں شامل لوگ ہنگامہ ختم کر کے آگے بڑھے۔ گپتا جی کے آدمی بھی اِدھر اُدھر ہو گئے۔ وشال بھی وہاں سے چلنے لگا کہ نوین گھر سے نکل آیا۔ بولا۔

"بڑے ہیرو بنتے جا رہے ہو۔ جھگڑا کروا کے ختم بھی کروا دیا۔"

وشال کو اس کی یہ بات بہت بری لگی۔ جھگڑا کروانے کی مجھے کوئی ضرورت نہ تھی اور نہ ہے۔ رہا جھگڑا ختم کرنے کا سوال تو میں نے اس لیے کیا کہ میں خون خرابے کے بالکل خلاف ہوں، بھلے ہی یہ سامنے والے کا شوق ہی کیوں نہ ہوں؟۔"

"تم...... تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔"

"الزام تو تم نے ہی لگایا تھا اور اس چناؤ مہم میں شودت کا خون تمہارے سوا کون کروا سکتا تھا اور مجھ پر بھی تمہارے سوا کون حملہ کروا سکتا تھا؟۔"

"شٹ اپ" وہ بہت غصے سے بولا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم لیڈر بن جانے کے چکر میں

ہو لیکن ہمارے گھر پر اس طرح حملہ کروا کر تم نے اپنی بربادی کو آواز دی ہے۔ دیکھو۔ وہ اپنے گھر کے ٹوٹے ہوئے شیشوں کی طرح اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ شیشے ہی ٹوٹ گئے ہیں نا میرے گھر کے؟ نئے لگ جائیں گے لیکن تیری زندگی کا ہر شیشہ میں اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا کہ تمہیں ہی تمہاری زندگی کی آخری سانس تک چھبتے رہیں گے۔ وہ گھر کی طرف مڑا لیکن پھر رُک کے بولا۔'' اور ہاں۔ شاید تم یہ سوچ رہے ہو کہ چناؤ ہار کر ہمارے پاس طاقت نہ رہی لیکن اپنی طاقت میں تمہیں بہت جلد دکھاؤں گا۔

وشال نے اُس کی باتوں کا زیادہ اثر نہ لیا اور پھر جا کر جلوس میں شامل ہوا لیکن اس کے دل میں اب یہ بات بیٹھ سی گئی تھی کہ آئندہ نوین اُسے زیادہ ہی پریشان کرتا رہے گا۔ اُس نے سوچا کہ اب شاید ممتا کے گھر میں بھی نوین کے رشتے زیادہ زوردار طریقے سے آئیں گے لیکن پھر سے اُس نے سوچا کہ اُسے جتنی جلدی نوکری ملتی ہے اتنی جلدی وہ ممتا کے ساتھ شادی کر کے یہ پریشانی ہمیشہ کے لیے مٹا دے گا۔ موہن بابو نے اُسے وعدہ دیا تھا کہ چناؤ میں کامیاب ہو جانے کے بعد وہ کسی کو کسی کا حق نہ لوٹ لینے دیں گے اور اُسے یقین تھا کہ اگر موہن بابو حق اور سچائی کی بات کر سکیں گے تو اُسے فوراً نوکری مل جائے گی۔ موہن بابو سے اپنے حق کی رکھوالی کی اُمید پر وہ بہت دیر تک نوکری کی آس لگائے بیٹھا رہا۔ اس دوران اُس نے دو امتحان بھی پاس کیے لیکن اُس کی ڈگری اُس کے ہاتھ میں ہی رہ گئی۔ اُس نے اپنے حق کی پہلی جیسی کھلم کھلا لوٹ دیکھی تو اس کی امید پھر سے ٹوٹنے لگی۔ میدانِ جنگ میں اُس نے اپنے جس سپاہی کو اُتارا تھا وہ اپنے میان سے اپنی تلوار بھی نہ نکال پایا تھا یا پھر اُس نے میان سے اپنی تلوار نکالنے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔ یہی بات اُس نے حق کے سپاہی موہن بابو سے کی تو وہ بولے۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ ایسا سماج ہے کہ جس میں سچ بولنے والے یا حق کی بات کرنے والے کو لوگ پاگل کہتے ہیں۔ ہنستے ہیں اُس پر۔ مذاق اُڑاتے ہیں اُس کا اور اگر وہ یہ سب سہہ بھی لے تو اُس کی موت کا سامان پیدا کیا جاتا ہے۔ تاکہ دوسروں کے لیے لوٹ کے راستے صاف رہیں۔ اب تم بتاؤ، ایک اکیلا آدمی حق اور سچ کا پرچم ہاتھوں میں لیے کب تک لڑ سکتا ہے؟ ایک اکیلا آدمی پورے سماج سے کیسے لڑ سکتا ہے؟

''تو...... تو آپ بھی یہ بات ماننے لگے ہیں؟''۔

''اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔''

''تو پھر...... تو پھر کیا آپ نے اپنے وہ اصول توڑ دیئے ہیں؟''

''میں نے نہیں توڑا ہے کوئی اصول ہاں اصولوں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔''

''لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کو دیکھ کر کتنے لوگوں کے اصول ٹوٹ جائیں گے؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ کتنے ہی لوگوں کا حق اور سچ پر سے اعتبار اُٹھ جائے گا۔''

اصول ٹوٹ جاتے ہیں یا اعتبار اُٹھ جاتا ہے میں کیا کر سکتا ہوں۔''تم مجھے بتادو کہ کیا یہ سماج......؟

''سماج کا سہارا نہ لیجئے بابو جی۔'' وہ درمیاں میں ہی بولا۔ اس سماج سے لڑنے کی طاقت اگر آپ میں نہ رہی ہے تو حق، انصاف اور سچائی کے واسطے وہاں سے لوٹ آئیں جہاں آپ کو اس چناؤ حلقے کے لوگوں نے اپنے بھروسے سے بھیجا ہے۔ آپ کی جگہ خالی ہو جائے گی تو ہم کسی اور کو وہاں روانہ کریں گے جو بے بسی سے اپنی ناکامی کا اعلان نہ کرے۔''

موہن بابو نے بڑے قہر کی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا لیکن پھر نرمی سے بولے۔

''اسمبلی کی یہ معیاد پوری ہوتے دیر نہ لگے گی۔ پھر تم ایسا سوچنا۔''

''ابھی کیوں نہیں؟''۔

''ابھی تم جاؤ، مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔''

وہ کچھ دیر تک موہن بابو کو دیکھتا رہا جیسے اُن کے چہرے سے یہ پتہ لگانا چاہتا ہو کہ کیا وہی موہن بابو اُس کے سامنے کھڑے ہیں جنہوں نے اپنے اصولوں کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی یا کوئی اور؟۔ اُس نے اپنی نظریں جھکا دیں۔ شاید وہ اُن کو پہچان نہ پایا تھا۔ صورت تو وہی تھیں لیکن باتیں کسی اور کی تھیں۔ وشال نے سوچا کہ وہ موہن بابو نہیں ہو سکتے ہیں۔ اگر ہوئے بھی تو پھر اُن کے اندر کوئی اور بیٹھ کر بول رہا ہے۔ شاید پیسہ یا پھر کرسی۔ اُس نے سوچا کہ پیسہ اور کرسی مل کر آدمی کو خراب کر دیتے ہیں۔ چاہئے وہ گپتا جی ہوں یا موہن بابو۔ وہ تیزی سے اُن کے گھر سے نکل گیا لیکن ابھی وہ گلی میں پہلا ہی موڑ مُڑ رہا تھا کہ اُس نے موہن بابو کے گھر کے کمپاونڈ میں گپتا جی کی کار کو داخل ہوتے دیکھا۔ وہ یہ دیکھ

کر حیران ہوا۔ گپتا جی کار سے نکل کر جوں ہی موہن بابو کے گھر میں داخل ہوئے۔ وشال دوڑ کر موہن بابو کے گھر کے کمپاونڈ میں چلا آیا اور پھر چل کر گھر کے دروازے کے قریب کھڑا ہوا۔ اُس نے اندر جھانک کے دیکھا تو چونک گیا۔ موہن بابو اور گپتا جی ایک دوسرے کے گلے ملے ہوئے تھے جیسے دو پکے دوست یا دو سگے بھائی مدتوں بعد ملے ہوں۔ وشال کو ماتھُر صاحب کی باتیں یاد آئیں۔

''یہ لیڈر لوگ صرف چناؤ کے دوران ہی لوگوں کے دوست ہوتے ہیں۔ یہ چناؤ تمہارے موہن بابو جیت جائیں گے یا گپتا جی جیت جانے کے بعد کامیاب اُمیدوار اپنے وفاداروں کو بھول جائے گا۔

وشال نے سوچا کہ ماتھُر صاحب ٹھیک کہہ رہے تھے۔ موہن بابو اپنے وفاداروں کو بھول گئے ہیں، وشال کو بھی بھول گئے ہیں۔ یہاں تک کہ شودت کو بھی بھول گئے ہیں اور شودت کے قاتل گلے ملے ہیں اور اسی طرح گپتا جی بھی اپنے وفاداروں کو بھول گئے ہوں گے۔ وشال نے سوچا کہ موہن بابو اور گپتا جی بھائیوں کی طرح یا دوستوں کی طرح ایک دوسرے کے گلے ملے ہیں اور اُن کے وفادار ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ سیاست دانوں کے احمق وفاداروں پر وہ مسکرا کر رہ گیا۔ موہن بابو گپتا جی کو اپنے برابر بٹھا کر بولے۔

''آپ نے یہاں آنے کی تکلیف کیوں کی؟ بات تو ہمارے درمیان ہو ہی گئی تھی۔''

''ہاں'' بات تو ہو ہی گئی تھی لیکن میں نے سوچا کہ سامنے سامنے ہر بات طے کرلوں۔ دراصل چوپڑہ خاندان کے ساتھ میری بہت پہلے سے دوستی ہے اور وہ میرے کاروبار میں بھی شریک ہیں اس لیے سرکاری دفتر میں اُن کا کام ہو جانا چاہئے۔

''بس ہو گیا، مان لیجئے۔ میں نے کل ہی چیف منسٹر صاحب سے بات کی ہے۔''

''باقی حساب وکتاب ہوتا رہے گا۔''

''اُس کی آپ فکر نہ کریں۔ کوئی اور کام ہو تو بتا دیں۔''

''ہاں'' ''ایک کام اور ہے۔ گپتا جی بولے۔'' دراصل میرے بیٹے نوین کے ذہن پر ایک لڑکی چھا گئی ہے۔ یوں تو کئی بڑے گھروں سے کئی رشتے آئے ہیں لیکن نوین کو دل لگی ہے اپنے محلے کے پروفیسر شام سندر کی لکچرر بیٹی ممتا سے۔ نوین کی ضد ہے کہ وہ ممتا کے

ساتھ ہی شادی کرے گا۔

"تو دیر کسی بات کی ہے۔"

"دیر نہیں ذرا مشکل ہے۔ وہ ہے نا آپ کا داہنا ہاتھ وشال؟ ممتا کے دل پر بد نصیبی سے وہ چھایا ہوا ہے۔ اب آپ بتائیے، میرا بیٹا ضد کرے گا تو میں آسمان سے تارے توڑ نہ لاؤں؟ ہاں ڈر ہے کہ اس سے بدنامی ہوگی اور بدنام لڑکی بتائیے اس گپتا کی بہو کیسے بن سکتی ہے؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"ہاں اور آپ کو سب کچھ ٹھیک کرنا ہوگا۔"

"کیا کرنا ہوگا مجھے۔"

"لاکھ دو لاکھ روپے جو بھی وہ مانگے اُس کے ساتھ طے کرلو۔ بھوکا ہے فوراً لے گا۔ بس ممتا کو میرے بیٹے کے لیے چھوڑ دے۔"

"اتنے معمولی کام کے لیے اتنی بڑی بولی نہ دیجئے گا گپتا جی۔ حوصلہ پائے گا وہ۔ ویسے ہے وہ بڑا چالو۔ ہاں بھوکا ضرور ہے۔ بھوک ہر چیز پر حاوی ہو جاتی ہے۔ فی الحال پچاس ہزار کی بات کر کے دیکھتا ہوں۔ نہ مانا تو لاکھ کی۔ پھر بھی نہ مانا تو کوئی اور راستہ سہی۔"

"ہے اور کوئی راستہ کیا؟"

"ہے نا" موہن بابو فوراً بولا "ہماری چناؤ ٹکر میں جوش کھا کر نوین نے دو خون کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ایک شودت کا اور ایک وشال کا۔ وشال تو کسی طرح بچ گیا۔ لیکن شودت کا کام تمام ہوگیا۔ اب ہمیں بھی تو قاتل کو تلاش کرنا ہے۔ ورنہ ہم اپنے لوگوں کو کیا جواب دیں گے؟"

"واہ کیا بات کہی؟" گپتا جی چہک کر بولے۔ ایک تیر سے دو نشانے؟"

"راج نیتی ہے ہی کھیل اُن آدمیوں کا جو ایک تیر سے دو نشانے لیتے ہوں۔ بڑا تنگ کرتا ہے مجھے وہ۔ کہتا ہے کہ میں سچ بولوں اور سچ کی حفاظت کروں۔ اب بتائیے میں یدشھتر یا ہریش چندر تو ہوں نہیں کہ سچ بولتا رہوں اور سچ کی حفاظت بھی کرتا رہوں۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

''میں تو کئی دنوں سے اُس کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کیسے اُس سے جان چھڑاؤں۔

''ایک چھوٹی سے نوکری دلوائے اُسے اُس کا منہ بند کرنے کے لیے یا پھر ممتا کی زندگی سے دور جانے کی یہی شرط رکھ لیجئے۔

''نہیں نہیں گپتا جی۔ موہن بابو فوراً بولے۔ اُسے نوکری دلوادوں گا تو اگلے چناؤ میں کام کس سے لوں گا؟ سرکاری نوکر ہو جانے کے بعد وہ چناؤ مہم میں حصہ لینے سے رہا اور ممتا کی زندگی سے دور جانے کی یہ شرط رکھنا تو سب سے بڑی غلطی ہوگی۔ وہ جب تک بے روزگار رہے گا تب تک اُس کی شادی نہ ہوگی۔ ایک بار وہ روزگار میں آگیا تو سب سے پہلے وہ شادی کے بارے میں سوچے گا اور جب شادی کے بارے میں سوچے گا تو صرف ممتا کے بارے میں سوچے گا۔

''یہ بھی آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔''

''ہاں۔'' آپ بے فکر ہو کر جائیے۔ چند دنوں میں موقعہ پا کر میں اُسے شودت کے قتل کے الزام میں گرفتار کروالوں گا۔ پھر بناتے رہے گا آپ ممتا کو اپنی بہو۔''

''شکریہ موہن بابو۔'' گپتا جی اُٹھتے ہوئے بولے۔ اب میں چلتا ہوں۔ وہ جانے کے لیے تیار ہو گئے تو باہر کھڑا وشال تیزی سے وہاں سے نکل گیا۔ اس کے ذہن میں زلزلے ہو رہے تھے۔ دُنیا میں کسی سے بھی حق اور سچائی کی اُمید کرنا اُسے بہت بڑا گناہ محسوس ہو رہا تھا۔ نا اُمیدی اُس کا ہر بچا ہوا حوصلہ توڑتی جا رہی تھی بلکہ اب تو اُسے اپنی زندگی بھی خطرے میں پڑی محسوس ہو رہی تھی۔ ہر ایک آدمی اُسے فریبی اور ڈھکو سلے باز نظر آ رہا تھا۔ کیا موہن بابو اور کیا گپتا جی؟۔ دونوں اُسے اُن گدھوں کی طرح نظر آ رہے تھے جو چاہئے جہاں بھی ہوں، جس حال میں بھی ہوں نظر ہمیشہ گوشت کے ڈھیروں پر رکھتے ہیں۔ وہ اپنا شہر چھوڑنے کی بات سوچنے لگا لیکن شہر چھوڑ کر وہ بزدل بھی نہیں کہلوانا چاہتا تھا اور نہ ہی وہ اپنی ماں اور نہ ممتا کو چھوڑ کر جانا چاہتا تھا۔ اُس نے سوچا کہ وہ جیے گا تو اپنے گھر میں، اپنے شہر میں اپنی ماں اور اپنی ممتا کے ساتھ جیے گا۔ وہ جیے گا تو بہادروں کی طرح بزدلوں کی طرح اپنا گھر، اپنا شہر چھوڑ کر نہ جائے گا۔ وہ اس بارے میں انجلی ماتھر سے ملا اور اُسے

ساری سازش بتادی۔

''تم گھبراؤ نہیں۔'' وہ کچھ سوچ کر بولی۔ میں اس بارے میں ڈیڈی سے بات کروں گی۔''

''میں بہت ڈر رہا ہوں انجلی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ مجھے اس سازش میں پھانس ہی لیں۔''

''تم بے فکر رہو۔ ایسا ہوا تو پولیس پر سے سب کا وشواس اُٹھ جائے گا اور ڈیڈی ایسا نہ ہونے دیں گے۔ تم پریشانی چھوڑ کر اپنے لیے کام کی تلاش کرو۔''

کام کی تلاش کے سلسلے میں وہ چوپڑہ سے ملنے گیا اور اُسے اپنی ساری پریشانی بتادی۔

وہ بولا۔ ''میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ آج کی دُنیا میں سچائی اور اصولوں کی کوئی قیمت نہیں ہے لیکن تم تو موہن بابو کے چہیتے بن کر اتنا بھی بھول گئے کہ یہ جنگ وہ اکیلے نہ جیت پائیں گے۔''

''کیسی جنگ اور کیسی جیت؟'' وشال نا اُمیدی سے بولا۔ وہ یہ جنگ لڑ کر ہار جاتے تب بھی کہا جا سکتا تھا کہ وہ کچھ کر گزرے ہیں وہ تو اس جنگ میں آپ ہی اپنی خوشی سے دُشمن کے خیمے میں پناہ لینے گئے۔

''بوڑھاپے میں عقلمند ثابت ہو گئے وہ۔''

''ہاں لیکن صرف اپنے لیے۔'' وشال فوراً بولا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ یہ بھی بھول گئے کہ وہ اپنے پیچھے وفاداروں کی ایک بہت بڑی فوج کو دشمنوں کے ہاتھوں مٹ جانے کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔''

''ایسی ہی دنیا ہے رے وشال اور ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم نے اچھا کیا کہ تم میرے پاس چلے آئے۔ موہن بابو کی فوج کے سالار تو تم ہی تھے نا؟ تم نے سمجھوتا کیا ہے تو باقی لوگ بھی کریں گے۔ آخر کہاں تک شرافت زندہ رہ سکتی ہے؟ خیر تم فکر نہ کرو۔ تم کو شرافت سے کچھ نہ ملا ہو نہ سہی، تم نے شرافت چھوڑ دی تو ضرور پھل بھی پاؤ گے۔ تم ایک ہفتے کے بعد میرے پاس چلے آنا۔ میں ضرور کچھ نہ کچھ کروں گا۔''

وشال کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ حق کی تلاش میں اُسے حق نہ ملا تھا سچ کو اپنا کر اُسے

کچھ بھی نہ ملا تھا۔ اس لیے حق اور سچ کی باتیں بھول کی اُس نے چوپڑہ سے جو پہلی ہی ملاقات کی تھی اُسی میں اُسے کامیابی کی اُمید افزا آواز بھی سنائی دی تھی۔ بلکہ اب تو کامیابی اور اُس کے درمیان صرف ایک ہفتے کا فاصلہ تھا۔ یہ خوشی اُس سے سنبھالی نہ جا رہی تھی اس لیے اُس نے یہ خوشی ممتا کے ساتھ بٹوری تو ممتا کی آنکھوں میں آنسوں بھر آئے۔ بولی۔

''آج بہت دنوں کے بعد خوشی ملی ہے مجھے۔''

''میری تو زندگی میں تمہارے بعد یہ پہلی خوشی ہے ری ممتا۔ دُعا کرو کہ زندگی میں خوشیاں ملتی رہیں۔''

''مجھے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھانے کی اب ضرورت نہیں پڑتی ہے بلکہ میرے ہاتھوں کو اب دُعا کے لیے اُٹھنے کی عادت سی ہوگئی ہے اور اب شاید میری دعا قبول ہوگئی ہے۔

''ہاں۔ شاید یہ تمہاری دعاؤں کا اثر ہے۔ بہر حال میں جلدی ہی چوپڑہ سے پھر ملنے جاؤں گا اور اُس سے مل کر تمہیں سب کچھ بتادوں گا۔''

ہفتے بعد چوپڑہ سے ملنے کے لئے وہ پھر اُسکے گھر گیا لیکن چوپڑہ نے اُسے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہاری بات کی تھی وشال لیکن افسوس کہ تم نے نوین کے ساتھ بہت بگاڑ دی ہے اور تم جانتے ہو کی وہ کسی بات کے لئے انکار کرے تو وہ بات میں دوبارہ نہیں کر سکتا ہوں۔''

''لیکن......؟۔''

''مجھے بہت افسوس ہے وشال۔'' وہ فوراً بولا۔ ''میں بہت مجبور ہوں۔ نوین اور اُس کے گھر کے ساتھ میرے بہت ہی نزدیک کے رشتے ہیں۔ ہم دونوں گھرانوں کا سارا کاروبار ساجھا ہوگیا ہے اور ایسے میں، میں نہیں چاہتا ہوں کہ اُسکی بات ٹال کر میں ہم دونوں کے لئے پریشانی پیدا کروں۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو چوپڑہ۔'' وہ ٹوٹ کر بولا۔ نوین تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔

''تم ٹھیک سمجھے ہو۔''

''ہاں اور آج مجھے اس بات کا افسوس ہو رہا ہے کہ میں جس آدمی کے پیچھے چلا تھا وہ بھی میرا نہ ہو سکا۔'' وہ ٹوٹتے ہوئے قدموں سے وہاں سے نکلا۔ لگا کہ وہ گھر نہ پہنچے گا۔

اب تو موت کا نام ہی اُسے اچھا لگ رہا تھا کیونکہ زندگی اُس کے لیے بہت کٹھور ثابت ہوئی تھی۔ مایوسی اُسے گہرے سمندروں میں ڈبوئے جا رہی تھی۔ کسی طرح وہ گھر پہنچا تو دیکھا کہ ماں کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔ وہ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ ماں نے اُسے پکارا۔ بولی۔

"تم میرے پاس بیٹھے رہو بیٹے میں...... میں جی بھر کے دیکھنا...... چاہتی ہوں...... تمہیں"۔ اُس کی آواز ڈگمگا رہی تھی۔ وشال بہت گھبرا گیا۔ بولا۔

"میں ڈاکٹر کو لے کر فوراً آ جاتا ہوں۔"

"اب ......اب کیا فائدہ ہے؟" اٹکی ہوئی سانسوں میں وہ بڑی مشکل سے بولی۔ "میں ......میں تو جاؤں گی ہی۔ لیکن تم...... تم وعدہ دو...... کہ...... کہ تم...... ممتا کا ......ساتھ ......نہ...... نہ چھوڑو گے۔

ماں کی کمزور گردن موت کا بھیانک جھٹکا نہ سہہ سکی اور ایک طرف لڑھک گئی۔ وہ ہمیشہ کے لیے اپنے لاڈلے بیٹے سے دور ہو گئی تھی اور ممتا کو اپنی بہو بنانے کا اُس کا سپنا سپنا ہی رہ گیا تھا۔ وشال پر رنج وغم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اُس کی ناکامیوں، مایوسیوں اور نا امیدیوں میں اُس کی ماں ہی تو تھی جو اُس کا سہارا بن کر اُس کی ہمت باندھ لیتی تھی۔ اب یہ سہارا بھی ٹوٹ چکا تھا۔ اُس کو سہارا دینے والا، اُس کی ہمت باندھنے ولا اب کوئی اور تھا تو صرف ممتا تھی جو وشال کو اس قدر ٹوٹا دیکھ کر خود بھی ٹوٹ سی گئی تھی۔ حالات کو جس قدر سُدھارنے کی کوشش کی جا رہی تھی، اُسی قدر وہ بگڑتے چلے جا رہے تھے۔ ممتا کو بھی کوئی راستہ نہ سوجھ رہا تھا۔

ماں کی چتا کی آگ ابھی ٹھنڈی بھی نہ ہو پائی تھی کہ بھائی اور بھابھی نے مل کر لالچ کی آگ میں اُسے جلا ڈالا۔ کچھ لڑ کر، کچھ ڈرا کر، کچھ پوچھ کر اور کچھ چوری سے وہ ماں کے سارے گہنے لے گئے اور الزام وشال کے سر لگا دیا کہ ماں کے سارے گہنے وہ ہضم کر گیا۔ وہ بے بسی میں آنسوں بہانے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا۔ ایک بار تو اُس نے زبان کھولنی بھی چاہی لیکن تب اُسے یہ یاد آ گیا کہ اُس کے باپ نے مرتے وقت اُس سے وعدہ لیا ہے کہ وہ اپنے بھائی کے منہ نہ لگے گا۔ اپنے ماں باپ کی اُسے عزت تھی۔ اُن کی بات کو ماں لینا وہ اپنا دھرم

مانتا تھا۔ کندن نے جو کچھ بھی کیا وہ سب کچھ سہہ کر چپ ہو گیا۔ اطمینان کرنے کو یہی بات اس کے لیے بہت تھی کہ بھائی اور بھابھی نے اُس پر ماں کے گہنوں کی ہیرا پھیری کا صرف الزام لگایا تھا اس بارے میں انہوں نے پولیس میں رپورٹ نہ لکھوائی تھی ورنہ شاید اس موقعے کا فائدہ اُٹھا کر گپتا جی اور موہن بابو اُسے گرفتار کروا ہی لیتے اور یوں وہ نوین کی شادی بھی ممتا سے کروا لیتے۔ ممتا بھی کئی بار افسوس ظاہر کرنے کے لیے اُس کے گھر چلی آئی لیکن ممتا سے بھی وہ کچھ نہ کہہ سکا بلکہ اُسے ممتا سے آنکھیں ملانے سے بھی شرم محسوس ہو رہی تھی۔ کتنی دیر سے ممتا اپنی آنکھوں میں سپنے سجائے بیٹھی تھی اور کتنی دیر سے وہ اُس سے انتظار کرواتا آیا تھا؟ ممتا کی عمر کی لڑکیوں کے گھر کب کے بس چکے تھے۔ کچھ کے تو کب کے بچے بھی ہو گئے تھے لیکن ممتا اب بھی اس کے لیے بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس دن کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی کہ جب وشال کماؤ ہو جائے حالانکہ اس کے لیے نوین جیسے کماؤ، عزت دار، اور رئیس زادے کا رشتہ بھی کئی بار آیا تھا۔ وشال اب ممتا کو اور انتظار کرنے کی بات نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اپنے مقدر پر اُسے اب ذرا بھی اعتبار نہ رہا تھا اور اُسے اب یہ اُمید بھی نہ رہی تھی کہ اُسے بھی نوکری ملے گی۔ جہاں اُمید نہ ہو وہاں انتظار کا کیا مطلب؟۔

ماں کی موت پر افسوس ظاہر کرنے کے لیے اُس کے گھر موہن بابو بھی چلے آئے۔ اُن کے آنے پر وشال حیران ہوا لیکن پھر یہ بات بھی جلد ہی اُس کی سمجھ میں آئی کہ موہن بابو محلے کے لوگوں میں بدنام ہو جانے کے ڈر سے وشال سے افسوس ظاہر کرنے آئے ہیں۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھے رہے۔ پھر جب جانے لگے تو وشال سے بولے۔

"اس مشکل وقت میں، میں تمہاری زیادہ مدد تو نہیں کر سکتا ہوں لیکن کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔"

وشال کچھ نہ بولا تو وہ پھر بولے۔ "ہاں میرے پاس تمہارے لیے ایک سودا بھی ہے۔

"سودا......؟"

"ہاں سودا جس میں تم پچاس ہزار کما سکتے ہو۔"

وشال فوراً ہی اُن کی مطلب سمجھ گیا۔ بولا۔ "گپتا جی کا سودا تو نہیں ہے۔"

موہن بابو نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ بولے۔ ''ہاں'' لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا۔''

''میں شہر کے ہر دلال کو جانتا ہوں۔''

''تم......؟ وہ غصہ ہو گئے۔ وشال بولا۔'

''مجھے یہ سودا منظور نہیں ہیں، بھلے ہی آپ مجھے شودت کے قتل میں پھانس کر پھانسی پر چڑھوا دیں۔''

''تم......؟''۔

''میں سب کچھ جانتا ہوں اس لیے آپ کو حیران ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن گپتا جی کے ساتھ مل کر آپ میرے خلاف جو سازش کر رہے ہیں اُس میں آپ کامیاب نہ ہوں گے۔''

موہن بابو اُس کی باتیں سن کر حیران بھی ہوئے تھے اور پریشان بھی۔ وہ وہاں سے نکلنے لگے تو وشال بولا۔''

''جا رہے ہیں۔''

''ہاں۔ تم اناپ شناپ بکتے جا رہے ہو۔''

''تھوڑی سی میری اناپ شناپ اور سنئے۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''بابو جی۔ گپتا جی بہت پرانے سیاست دان ہیں۔ ان کی دوستی ہی آپ کو لے ڈوبے گی۔''

''تو تم کیوں پریشان ہو؟''۔

''مجھے کوئی پریشانی نہیں ہیں لیکن آپ کو آگاہ کرنا میں نے اپنا فرض سمجھا تو کہہ دیا۔ باقی آپ کی مرضی۔''

کچھ دن اور وشال گھر سے باہر نہ نکل سکا کیونکہ گھر میں اب بھی افسوس ظاہر کرنے والے آ رہے تھے اور اُس کے بھائی نے یہ ذمہ داری پوری طرح اُسی کے اوپر چھوڑ کر اپنے کرایے کے گھر کی راہ لی تھی جو کہ ایک اچھی سی کالونی میں تھا۔ گپتا جی اگرچہ طاقت میں تو

نہ تھے لیکن اُس کے باوجود اُن کی مہربانیوں سے کندن بہت ترقی کر رہا تھا۔ وشال گھر سے تب نکلا جب ممتا نے اُسے کسی ضروری کام سے بُلایا تھا۔ ممتا کی آنکھوں میں پانی دیکھ کر وہ اندر ہی اندر رو پڑا۔ بولا۔

"رونا میرا مقدر ہے۔ تم آنکھوں میں ساگر لیے کیوں خاموش کھڑی ہو۔"

"ہمارے مقدر تو جڑے ہوئے ہیں، پھر آنسو تمہاری آنکھوں میں ہوں یا میری آنکھوں میں، کیا فرق پڑتا ہے؟"

"اپنے آنسوؤں کی وجہ بتادو۔ پتہ تو چلے کہ آج میرے مقدر پر کون سی بجلی گری ہے۔؟

"تم یوں بھی پریشان ہو۔"

"تم بے فکر ہو کر بتادو، مجھے کچھ نہیں ہوگا۔"

"اب......اب گھر والے ضد کرنے لگے ہیں۔"

اُس کی آنکھوں میں ان چاہی نمی دیکھ کر وشال پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ اُس کی زندگی کی کشتی بھنور میں ڈوب رہی ہے۔ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ممتا سے کیا کہے؟ اُس نے سوچا کہ اگر ممتا کے گھر والے ضد کرنے لگے ہیں تو اُن کی ضد جائز ہے۔ ناجائز نہیں۔ بیٹی کی شادی ماں باپ کی ذمہ داری ہوتی ہے اور ہر ماں باپ یہ ذمہ داری وقت پر انجام دینا چاہتے ہیں۔ ممتا کے گھر والے بھی ایسا ہی چاہتے ہیں تو اُن کا کیا قصور ہے؟۔ وہ ممتا کو اور انتظار کرنے کی بات کہہ کر اُس کی جوانی ضائع بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس کی سونی مانگ کب سے سیندور مانگ رہی تھی؟ کب سے اُس کی ہتھیلیاں مہندی کی طلب گار تھیں؟ اُس کی مانگ کو سیندور اور اُس کی ہتھیلیوں کو مہندی صرف وشال کی وجہ سے نہ مل رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک اندر ہی اندر کچھ سوچتا رہا۔ سر جھکا کر وقت کے ہر پہلو پر غور کر رہا تھا۔ ہر چیز اُس کے خلاف جا رہی تھی۔ وہ چٹکی بھر سیندور خریدنے کے قابل بھی نہ تھا۔ وہ مٹھی بھر مہندی خریدنے کی طاقت بھی نہ رکھتا تھا۔ شادی کر کے وہ ممتا کو اپنے گھر لانے کی بات سوچنا دور کی بات تھی وہ بہت سوچ سمجھ کر ممتا سے نظریں چُرا کر بولا۔

"تم......تم جا کے شادی کے لیے ہاں کہہ دو۔"

"ہاں کہہ دوں......؟ اُس نے حیرت سے پوچھا۔"

''ہاں ممتا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ تمہارے گھر والے تمہیں میرے ساتھ میری دُنیا کے اندھیرے راستوں پر جانے کی اجازت ہرگز نہ دیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ تم اپنی جوانی کے جوش میں میرے ساتھ میری دُنیا کے اندھیرے راستوں پر جانے کی بات سوچ بھی لو لیکن اس بات کی اجازت میں تمہیں نہ دوں گا۔''

''تم......تم......؟ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔''

مجھے سمجھنے کی کوشش کرو ممتا۔ وہ اُسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ زندگی اندھیرے راستوں میں نہیں بلکہ اجالوں کی محفل میں ہوتی ہے۔ میں نے تم سے پیار کیا ہے، پوجا کی ہے تمہاری میں نے۔ کئی سالوں سے میں یہی سپنے دیکھتا رہا ہوں کہ ہم دونوں ایک ساتھ جئیں اور مریں۔'' اُس کی آواز بھر آئی تھی۔'' بولا۔'' آج بھی میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ آج بھی تم کو پوجتا ہوں میں۔ آج میں تم کو خود سے الگ نہیں کرنا چاہتا ہوں لیکن تمہیں اپنے ساتھ رکھ کر میں تمہیں کیا دے سکتا ہوں؟۔ یہی سوچ کر میں تم کو خود سے الگ کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ میری زندگی کے راستوں میں اُجالے ہو جائیں گے اور میں تمہیں اپنے ساتھ اُن اجالوں میں لے جاؤں گا۔ اپنی ہر تمنا پوری کروں گا۔ جی بھر کے پیار کروں گا تمہیں۔ ہمیشہ پیار کرتا رہوں گا تمہیں لیکن میری زندگی میں کبھی اُجالے ہوں گے ایسا ہوتا نہیں لگتا ہے۔ شاید میرے نصیب میں اجالے نہیں ہیں، خوشی نہیں ہے، پیار نہیں، اس لیے تم اپنا گھر بسالو۔''

''ایسا......؟'' بہت ہی زبردستی، بہت ہی جتن کر کے وہ خود کو سنبھالتے ہوئے اور اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوں روکتے ہوئے بولی۔ ایسا کیسے ممکن ہے؟''

''ممکن ہے ممتا ممکن ہے۔ وہ بھی زبردستی اپنے آنسوں روکتے ہوئے بولا۔'' دُنیا میں ہر چیز ممکن ہے۔ دلوں کا ٹوٹ جانا بھی ممکن ہے۔ سپنوں کا ٹوٹ جانا بھی ممکن ہے۔ تقدیروں کا بدل جانا بھی ممکن ہے۔ یہاں آرزوؤں کا مٹ جانا بھی ممکن ہے۔ ممتا ہر ایک چیز ممکن ہے۔ یہاں خوشی سے اپنے جگر کے ٹکڑے کو خود سے الگ کرنا بھی ممکن ہے۔ یہاں آنکھوں کے نور کو بھی آنکھوں سے الگ کرنا ممکن ہے۔ یہاں دل پر پتھر رکھ کر سب کچھ کہہ دینا بھی ممکن ہے۔ یہاں ہر چیز ممکن ہے ممتا۔ ایک نوکری ملنے کے علاوہ!!!''

وہ اُسے دیکھتی رہی۔ یقین کرنے کو جی نہیں کر رہا تھا کہ یہ وشال ہی ہے جو ایسی باتیں کر رہا ہے۔ اُن کی محبت ایک انمٹ سچائی ہے۔ یہ دونوں کو معلوم ہے۔ پھر سچائی کو دفنانا ممکن نہیں ہے۔ اُن کے رشتے، رشتے ہی نہیں احساس ہیں اور احساسات کو فراموش کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ کوئی مٹی کا کھلونا نہیں کہ پھینکا جائے یہ تو احساس ہے جو بہر حال محسوس ہوتا رہے گا۔ باہیں چاہئے کسی کی بھی ہوں پیار کی حرارت تو وہی رہے گی۔ جسم پگھلتا جائے گا اور محسوس یہی ہوتا رہے گا کہ حرارت وشال کی ہی جوانی کی ہے۔ وہ بولی۔

''کیا یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دونوں اپنی دھڑکنوں سے اُن کی آواز الگ کر سکیں؟''

''ممتا گیت تو لاکھوں ہوں گے دُنیا میں گانے کے لیے، گنگنانے کے لیے، لیکن نئے گیت تو پھر بھی لکھے جاتے ہیں اور دلوں کی دھڑکنیں نئے گیتوں کے ساتھ بھی بجتی ہیں۔''

''میں نے ایک ہی گیت گایا ہے۔ تمہاری محبت کا گیت۔ جو تم نے بھی میرے ساتھ گایا ہے۔ اُسی گیت کو لے کر میرے دل کی ہر دھڑکن بجتی ہے۔ وہی گیت میری زندگی ہے۔ اُس گیت کا بھول جانا ممکن نہیں ہے۔''

''اب تمہیں ہر ناممکن کو ممکن بنانا ہوگا ممتا۔ تم جس کام کو مشکل سمجھتی ہو وہ تمہاری ہمت سے آسان بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ تم کوئی بھی کام سچے دل سے کرنا چاہو تو پھر ہر چیز ممکن ہے۔'' وہ تیزی سے وہاں سے نکل گیا۔ اُس نے مڑ کر بھی ممتا کو نہیں دیکھا اور نہ ہی اُس نے ممتا کی کوئی آواز سننے کی کوشش کی۔ دل تھا کہ مچل رہا تھا لیکن وہ تھا کہ پیچھے مڑ کے بھی نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اپنے ساتھ وہ ممتا کو بھی خراب نہ کرنا چاہتا تھا، ممتا کی خوشیاں اُسے بہت پیاری تھیں اس لیے وہ ممتا سے بہت دور جانا چاہتا تھا۔ چاہئے اُس کے دل کا کچھ بھی حال ہو۔

بہت دیر تک وہ یوں ہی آواروں کی طرح سڑکوں پر گھومتا رہا۔ بازاروں میں بڑی چہل پہل تھی۔ رنگین جسم اپنے خوبصورت چہرے لیے مستی میں گھوم رہے تھے۔ ہر انسان شادمان تھا۔ بس وشال ویران تھا۔ اب اُس کے دل میں کوئی تمنا نہ تھی، کوئی آرزو نہ تھی۔ تمناؤں اور آرزوؤں کو وہ بھی اپنے پیچھے چھوڑ کے آیا تھا۔ بازار کی رونق سے گھبرا کر وہ ایک پارک میں داخل ہوا۔ رونق یہاں بھی کم نہ تھی۔ پارک میں بنے اُچھلتے فوارے کے پاس

ایک جوڑہ مسکراتے ہوئے دھیمی سے مگر میٹھی سی سرگوشیاں کر رہا تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑا۔ یہاں مخملی گھاس پر پھولوں کی خوشبوؤں کے ساتھ کئی اور جوڑے پیار کی خوشیاں بٹور رہے تھے۔ وشال نے سوچا کہ کہاں کون سی کمی رہ گئی اُس کے مقدر میں؟۔ اُس نے بہت کوشش کی تھی اپنی دُنیا سنوارانے کی۔ کیا خوشبوئیں اب بھی اُس کے ذہن میں تازہ تھی۔ گو کہ ممتا کو وہ خود سے الگ کر چکا تھا لیکن اس کے بدن کی خوشبو سے خود کو الگ کرنا شاید اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ ممتا کی ہر یاد کو وہ بھول جانا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر یہ ممکن نہ ہوا تو وہ کہیں دور چلا جائے گا۔ اس محلے کی اور اس شہر کی فضاؤں سے دور۔ دوسرے شہر کی فضاؤں میں ممتا کے جسم کی خوشبو نہ ہوگی۔ آخر فضاؤں میں تحلیل ہو کر تو خوشبو کھو بھی جاتی ہے۔ وشال پارک میں بیٹھے ہوئے جوڑوں کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ دراصل اپنے غم میں آدمی سے دوسروں کی خوشیاں نہیں دیکھی جاتی ہیں۔ یہی وشال کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بہت زیادہ کھلبلی تھی اس لیے دوسروں کی پُرسکون زندگی بھی نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ آدمی کی فطرت ہے۔ جلن نہ ہو، حسد نہ ہو، تعصب نہ ہو تو ضرور ہوتا ہے۔ وہ یہاں ٹھہرنا بھی نہ چاہتا تھا اس لیے وہ چل کر پارک کے آخری ویران کونے میں جا پہنچا جہاں گھنی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں جو شام کے اُن سایوں میں بڑی بھیانک لگ رہی تھی جیسے تنہائی اُس کی ماں ہو یا پھر اس کی ممتا ہو۔ ویسے بھی ماں کی موت کے بعد اور ممتا کو اپنے جیون سے الگ کرنے کے بعد اُس نے تنہائی کے ساتھ پیار کرنا سیکھا تھا۔ ماں مرگئی تھی، ماں کی موت کے بعد وہ خود کو ممتا سے الگ کر بیٹھا تھا۔ اب سارا پیار، ساری محبت تنہائی کے لیے تھی۔ وہی اُس کی آخری اور واحد سہیلی تھی۔

تبھی کوئی ہلکی سی آواز سُن کر وہ چونک گیا۔ تو بیٹھے ہی بیٹھے اُس نے پیچھے مُڑ کے دیکھا۔ بھیانک گھنی جھاڑیوں میں ایک معصوم مگر رنگین جسم کسی کے مضبوط بانہوں میں لہرا رہا تھا۔ وشال نے وہ رنگین لباس بھی دیکھا اور وہ لہراتا ہوا جسم بھی دیکھا تو اُسے ہر چیز سے نفرت ہونے لگی۔ مردوں کے بارے میں پہلے ہی اُس کی رائے تھی کہ یہ گری ہوئی اور بھٹکی ہوئی جنس ہے لیکن عورت کے بارے میں اُس کی رائے بالکل مختلف تھی۔ آج تک اُس نے عورت کی صرف پوجا کی تھی اُس نے ماں کی پوجا کی تھی کیونکہ اُس نے ماں کی شفقت دیکھی

تھی۔ اُس نے ممتا کی پوجا کی تھی کیونکہ اُس نے ممتا کی محبت دیکھی تھی لیکن عورت کا یہ روپ اُس نے آج پہلی بار دیکھا تھا۔ عورت اتنا گر سکتی ہے، اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا لیکن تبھی وہ لہراتا جسم ذرا سا پہلو بدل کر اُس کے ٹھیک سامنے آ گیا۔ وشال نے دیکھا۔ بدن نیم عریاں ہو گیا تھا اور بے حس بھی ہو گیا تھا۔ کوئی حرارت نہ تھی جیسے برف کی کسی سل کو توڑا جا رہا ہو۔ کسی کی مضبوط اور جوان بانہیں اُس ٹھنڈے اور بے حس جسم کو جھلا رہی تھیں اور جسم کی آنکھوں میں پانی تھا۔ جیسے اُس جسم کی عزت کے دریا میں باڑھ آ گئی ہو۔ آتما کی دھرتی سے پھوٹتا ہوا پانی تھا وہ جو اُس عورت کی مجبوری اور بے بسی کی کہانی سُنا رہا تھا۔ دُنیا میں مجبوروں اور بے بسوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ایسے لوگ ہر جگہ موجود ہیں۔ خود وشال کو اس بات کا اندازہ تھا۔ مجبوری اور بے بسی سے وہ واقف تھا وہی اس کا ماضی تھا، وہ حال اور شاید وہی مستقبل بھی ہو۔ وہ اپنی آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ وہ کچھ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ نہ اُس عورت کے آنسوں اور نہ اُس مرد کا چہرہ۔ تھوڑی دیر میں اُس نے کسی کے قدموں کی آہٹ سُنی لیکن اُس نے پھر بھی اپنی آنکھیں نہ کھولی۔ تھوڑی دیر میں اُسے اس کے سامنے کسی کے رُکنے کی آہٹ بھی محسوس ہوئی لیکن پھر بھی اُس نے اپنی آنکھیں نہ کھولی۔

''یوں آنکھیں بند کر کے تم اس بات سے انکار نہ کر سکو گے کہ تم ایک بہت ہی گرے ہوئے آدمی ہو۔ اُس عورت کی آواز پھر آئی تو وشال نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ سامنے وہی خوبصورت جوان سالہ عورت تھی جس کو ابھی کچھ دیر پہلے وشال نے کسی کی بانہوں میں جھولتے ہوئے دیکھا تھا۔ وشال نے اپنی نظریں جھکا دیں۔

''شرم آ رہی ہے تمہیں؟'' اُس عورت نے پوچھا۔ وشال کچھ نہ بولا۔ وہ پھر بولی'' مجھے معلوم ہے کہ تم اپنے اندر میرے بارے میں بہت کچھ سوچ رہے ہو۔ تم میرے بارے میں جیسا بھی سوچو تمہارا حق ہے۔ تم جیسا بھی سوچو وہی سچ ہے لیکن اُس سے بڑا سچ یہ ہے کہ میں لُٹ گئی ہوں۔''

''نہیں'' وشال فوراً بولا۔ تم لُٹ نہیں گئی ہو۔''

''تو پھر میں بک گئی ہوں۔''

''تم......؟''

''ہاں''میں کہتا ہوں کہ تم نہ لٹ گئی ہو اور نہ بک گئی ہو۔''

''دیکھو، تم سب کچھ دیکھ چکے ہو اور سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی تم یہ کہہ رہے ہو؟

''ہاں''میں سب کچھ دیکھ چکا ہوں میں۔ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ چکا ہوں میں۔ اپنی آنکھوں سے تمہاری آنکھوں میں آنسوں بھی دیکھ چکا ہوں میں۔

''آنسوں ......؟ وہ اپنی آنکھوں کے آنسوں اپنی میلی سی ساڑی کے پلو سے خشک کرتے ہوئے بولی۔''یہ آنسوں تو آتے ہی رہیں گے اور ان کو آنچل سے سُکھاتے رہنا بھی پڑے گا چاہئے آنچل صاف ہو یا داغدار کیونکہ دُنیا میں اس جوان ماں کے آنسوں پونچھنے والا کوئی نہیں ہے چاہئے کتنی بار بھی اس جوان ماں کو لٹ جانا پڑے یا بک جانا پڑے۔ تم نے بھی تو اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔

''اور کیا کرتا؟''وہ فوراً بولا۔''آنکھیں بند نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔ تم جو حاصل کرنے کے لیے یہ سب کر رہی تھی وہ میرے پاس بھی نہیں ہے کہ تمہیں اُس کی بانہوں سے نکال لیتا۔ ارے میں تو کہتا ہوں کہ تم سے زیادہ بے بس اور مجبور میں ہوں تم نے کم از کم اپنی قیمت تو لی ہوگی جس سے تم اپنی ضرورت پوری کروگی اور میں ......؟ مجھے دیکھو اس جوانی میں، میں یہاں بیٹھ کر رات کی روٹی کے لیے پریشان ہوں۔''

اُس کی آنکھوں میں پھر آنسوں بھر آئے اور اُن ہی آنسوں کو لے کر وہ بولی۔''منا بہت بیمار ہے۔ اس کے لیے دوائی لینی ہے۔ پچاس روپے ملے ہیں، دس تم رکھ لو، رات کو روٹی کھالینا۔''

''نہیں نہیں''وہ درد کی شدت سے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر تڑپتے ہوئے بولا۔'' مجھے ذلیل نہ کرو۔ اس سے تو اچھا ہے کہ میں خود کو پھانسی لگالو یا کسی گاڑی کے نیچے آکر مر جاؤں۔''

بہت بزدل ہو''وہ بولی۔''اس طرح ٹوٹ کر مر جانے سے تو اچھا ہے کہ وہ لوٹ لو جو تمہیں نہیں مل رہا ہے۔ یا پھر اُس کو مارو جو تم سے کچھ چھین رہا ہے۔ کم از کم باقی لوگوں کے لیے تو کچھ سبق چھوڑ کر تو جاؤ گے۔ میں عورت ہوں، کمزور ہوں لیکن تم تو مرد ہو اور وہ بھی جوان۔ شرافت سے روٹی نہ حاصل ہو تو لوٹ کر حاصل کرلو کیونکہ ہر کوئی لوٹ رہا ہے

کوئی روٹی لوٹ رہا ہے تو کوئی عورت لوٹ رہا ہے۔ چلتی ہوں۔ وہ چلنے لگی تو وشال نے اُسے پکارا۔

''سُنو۔''

''ہاں'' وہ رُک گئی۔

''مُنّے کا باپ کہاں ہے۔''

روتے اُس کی خوبصورت آنکھیں سوجھ گئی تھیں۔ سوجھی ہوئی آنکھوں کے اندر خون کے ڈورے بھی پڑے تھے۔ آنسوں سے اس کا میلا سا آنچل گیلا بھی ہو گیا تھا لیکن وشال کے اس سوال پر لگا کہ ابھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے گی۔ اور پارک کے اُس اندھیرے کونے میں پورے شہر کو جمع کرے گی لیکن جانے کیسے وہ اپنے آپ کو روک کر بولی۔ ''وہ شہید ہو گیا ہے۔''

''فوجی تھا......؟ وشال نے بڑے دُکھ سے کہا۔

''وردی نہ تھی لیکن فوجی ضرور تھا۔ سچ کا فوجی بنا تھا وہ لیکن اُسے پتہ نہ تھا کہ وہ جسے سچ سمجھ رہا ہے وہ جھوٹ ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''پچھلے چناؤ میں اُس نے موہن بابو کا ساتھ دیا تھا اس لیے گپتا جی نے اُس کا خون کرایا۔''

''تم......؟ وہ اُچھل سا گیا۔ تم شودت کی بیوہ ہو۔''

''ہاں......لیکن تم اُسے کیسے جانتے ہو۔''

''میں......میں نے اُسے دیکھا ہے۔ بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں بھی موہن بابو کو ساتھ دینے والوں میں سے ہوں۔ لیکن شودت کے شہید ہو جانے کے بعد تم موہن بابو سے نہ ملی۔''

''ہاں ایک بار نہیں کئی بار ملی۔ میں نے اُسے فریاد کی لیکن کوئی انصاف نہ ملا۔''

''ایسے لوگوں سے انصاف کی اُمید نہیں کی جا سکتی ہے۔'' وہ نفرت سے بولا۔ ''بہت خود غرض ہوتے ہیں یہ۔ صرف چناؤ کے دنوں میں یہ ہم جیسے لوگوں سے پیار سے

پیش آتے ہیں۔

"تم دُرست کہہ رہے ہو۔ میں آج بھی اُسے ملی تھی۔ منے کی بیماری کی وجہ سے اس سے مدد مانگنے گئی تھی۔ مدد تو اُس نے کوئی نہ کی لیکن ایک سودے کی پیشکش کی۔"

"تمہارے...... تمہارے جسم کا سودا؟"۔

"نہیں۔ برہم چاری ہے وہ اس لیے ایسی کوئی بات نہ کی اُس نے"۔

"پھر......؟"۔

"اُس نے مجھے میرے مرد کے قاتل کا نام بتا دیا اور سودا یہ کیا کہ اگر میں عدالت میں اس کے خلاف بیان دوں تو وہ مجھے دس ہزار روپے دے گا۔

"کون ہے وہ؟"۔

"موہن بابو کا پڑوسی وشال"۔

"نہیں" وشال کو اپنے نیچے بینچ پھسلتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ بولی۔

"اُس نے یہی بتایا تھا"۔

"تم...... تم نے کیا فیصلہ کیا؟"۔

"میں نے فوراً نا کہہ دی تھی"۔

"کیوں۔ دس ہزار روپے لے کر تمہارے ہزار خرچ پورے ہو جاتے، ہاں کہہ دینی تھی۔"

"موت کے بعد میرے پتی نے اوپر آسمان سے مجھے بکتے ہوئے دیکھا ہوگا تو اُسے بہت دُکھ ہوا ہوگا لیکن کسی بے گناہ کے خلاف بیان دے کر میں اُسے پھانسی چڑھا دوں اس سے تو میرے پتی کی آتما رو اُٹھے گی۔ مجھے معلوم ہے کہ وشال نے وہ خون نہیں کیا ہے۔ میرے مرد کو تو گپتا جی کے آدمیوں نے مارا ہے اسی لیے میں اپنے پتی کا بدلہ لینے وشال کے گھر نہ گئی۔

"تم وشال کو جانتی ہو؟"۔

"دیکھا نہیں ہے لیکن میرا مرد کہتا تھا کہ وہ اُس کا ایک اچھا ساتھی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ دونوں ہی موہن بابو کے حامی تھے تو وہ ایک دوسرے کا قتل کیوں

کرتے؟"۔

"اور کیا جانتی ہو اُن کے بارے میں؟"۔

"کچھ زیادہ نہیں لیکن ہاں اتنا ضرور سنا ہے کہ وشال ایک دیوتا ہے اور دیوتا کبھی کسی کا قتل نہیں کرتے ہیں۔ وہ تیزی سے وہاں سے چل دی۔

وشال سے اُٹھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ گرفتاری، قتل کے الزام، عدالت اور پھانسی کے احساس سے وہ کانپ رہا تھا۔ موہن بابو اُس کے خلاف سازش کرنے لگے تھے اور اب اُس کے خلاف ثبوت بھی اکھٹا کر رہے ہیں، اُسے موہن بابو سے نفرت ہونے لگی۔ موہن بابو کے لیے اُس نے کیا نہ کیا تھا اور وہی موہن بابو اُس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں۔ یہ سوچ کر اُسے موہن بابو سے نفرت ہونے لگی۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ ممتا کے پاس چلا جائے اور اُسے کہہ دے آ ممتا دیکھ لے، اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ دُنیا میں کیا کیا ممکن ہے؟ کرسی اور طاقت کے ساتھ جب پیسہ ملتا ہے تو انسان رشتے اور ساری قدریں بھول جاتا ہے اُس نے سوچا کہ اب وہ دنیا میں کسی پر بھی بھروسہ نہ کرے گا۔ موہن بابو پر بھی نہیں، گیتا جی پر بھی نہیں۔ اپنے بھائی پر بھی نہیں اور نہ کسی اور پر۔

دور پارک میں اُس نے دو پولیس والوں کو داخل ہوتے دیکھا تو اُس کے بدن میں جھُرجھُری سی آ گئی۔ سوچا کہ کہیں موہن بابو اپنے کھیل کو جلد ہی انجام تک تو نہیں پہنچانا چاہتے ہیں۔؟۔ کہیں وہ پولیس والے اُسے گرفتار کرنے تو نہیں آئے ہیں؟ ایک بار یہ بھی سوچا کہ اُسے پارک کی دیوار پھلانگ کر بھاگ جانا چاہئے لیکن پھر وہ یہ سوچ کر بیٹھا رہا کہ دنیا کا کوئی بھی آدمی پولیس سے بھاگ نہیں سکتا ہے اور یہ کہ وہاں سے بھاگ کر وہ ناحق پولیس والوں کے دلوں میں کوئی شک کیوں پیدا کرے۔ اُس نے سوچا کہ جب اُس نے کوئی جرم ہی نہ کیا ہے تو وہ کیوں کسی سے ڈرے؟ پولیس والے پارک میں موجود لوگوں سے کچھ پوچھتے ہوئے اس کی طرف آنے لگے۔ اُس کا دل خوف سے دھک دھک کرنے لگا لیکن پھر بھی وہ بیٹھا رہا۔ پولیس والے اس کے بالکل سامنے کھڑے ہو گئے۔ وہ اپنی سانسیں روک کر رہ گیا۔ انہوں نے پوچھا۔

"تم یہاں کب سے بیٹھے ہو۔"

''جی آدھا گھنٹہ ہو گیا۔''

''تم نے یہاں کسی اور کو دیکھا''

''میں نے ......نہیں تو۔''

''دیکھا ہے تو صاف صاف بتادو۔ ایک عورت ایک مرد......؟''

وہ سمجھ گیا کہ وہ شودت کی بیوہ کے بارے میں پوچھ رہے ہیں بولا۔'میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔''

''پھر تمہارے آنے سے پہلے نکل گئی ہو گی۔''

''کہ......کون تھی وہ؟'' اُس نے مشکل سے پوچھا۔

''ارے ہاتھ لگے تو پتہ چلے۔ آج پہلی بار شکایت ملی ہے۔ سالی نیا نیا دھندا کرنے لگی ہے۔''

''مجبوری بھی ہو سکتی ہے۔''

پولیس والوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ فوراً بولا۔''میرا مطلب ہے کہ شاید مجبوری میں ایسا کرنے لگی ہو۔''

''تو میونسپلٹی کا یہ پارک دھندا کرنے کا اڈہ ہے کیا؟۔ ایک پولیس والا بولا۔'' وہ بھی ہم سے اجازت لیے بغیر۔ سالی ملے گی تو سمجھا دوں گا اُسے۔ وہ تیزی سے اپنے دوسرے ساتھی کو لے کر وہاں سے نکل گیا تو وشال سوچتا رہا کہ کیا اُن سے اجازت لے کر کسی عورت کا دھندا کرنا جائز ہے اور کیا ان پولیس والوں کو شودت کی بیوہ کے جسم کے ساتھ کھیلنے والے نے ہی اطلاع دی ہے؟۔ اگر ایسا ہے تو کیا پولیس بھی ایسا کام کرنے والوں کے ساتھ ملی ہوئی نہیں ہے! یہ سوچ کر وشال کو بہت دُکھ ہوا۔ کچھ دیر میں وہ اُٹھ کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ رات ہونے والی تھی لیکن بازار میں ابھی خاصی چہل پہل تھی۔ تبھی ایک جگہ وہ کئی لوگوں کو جمع دیکھ کر رُک گیا۔ جمع شدہ لوگوں کے دائرے میں ایک عورت پھوٹ کر رو رہی تھی۔ وشال اُس عورت کو دیکھ کر چکر کھا کر رہ گیا کیونکہ وہ کوئی اور نہیں بلکہ شودت کی بیوہ تھی!!۔

عورت، جو ماں ہوتی ہے، ماں، جو قربانی کی مثال ہوتی ہے۔ وہ بھی ایک ماں تھی جو

ابھی کچھ دیر پہلے اپنے بچے کی دوا خریدنے کے لیے اپنی عصمت فروخت کر کے آئی تھی۔ بچہ اس کی گود میں تھا اور بچے کی دوائی اس کے سامنے بکھری ہوئی تھی کیونکہ اب اس بچے کو دوائی کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ اب وہ بچہ مر گیا تھا اور مرحوم شودت کی بیوہ زار زار رو رہی تھی اور روتے ہوئے بھیک مانگ رہی تھی تا کہ وہ اپنے بچے کے لیے کفن خرید سکے اس کے آخری رسوم پورے کرے۔

وشال رو پڑا کیونکہ ایک معصوم بچے کو موت کے بعد کفن نہیں دستیاب تھا اور اُس بچے کی ماں زار زار رو رہی تھی۔ لگا پورا بھارت رو رہا ہے۔ بھارت کی آزادی رو رہی ہے۔ پہلے زمانے میں انگریز انگریزوں کے خلاف بولنے والوں کو مارتے تھے۔ آج کے زمانے میں موہن بابو اور گپتا جی جیسے لوگ ان کو مارتے ہیں جو اُن کے خلاف بولنے کی ہمت کریں۔ دیش آزاد ہے یا غلام ہے۔ وشال کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ دیش میں جمہوریت ہے یا پھر چند لوگوں کی طاقت کی سرکار ہے۔ وشال کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا وہ بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس نے شودت کی بیوہ اور اُس کے بچے کو پھر سے دیکھا، لگا بھارت ماں اپنی گود میں جمہوریت کی لاش لیے کفن ڈھونڈ رہی ہے۔ آنکھوں میں آنسوں لیے اس کے کفن دفن کے لیے بھیک مانگ رہی ہے۔

آج نہیں یہ آزادی کے پہلے دن سے ہو رہا ہے اور شاید یہ آگے بھی ہوتا رہے گا۔ وشال نے سوچا کون روکے گا اس انہونی کو؟ بھگت سنگھ پہلے ہی شہید ہو گئے ہیں، راجگرو اور سکھ دیو بھی پھانسی چڑھ گئے ہیں۔ اشفاق اور لالہ جی بھی امر ہو گئے ہیں۔ وہ سب جمہوریت کے لیے لڑے تھے۔ اب کون لڑے گا؟ کیا اُن سارے شہیدوں کو پھر سے جنم لینا ہوگا؟ کیا تب ہی عملی جمہوریت کا چلن ہوگا دیش میں؟۔

شودت کی بیوہ بھیک مانگ رہی تھی لیکن سامنے ایسا کوئی آدمی نہ تھا جو اُسے کچھ دیتا۔ سب اُس کے بارے میں یہی کہہ رہے تھے کہ وہ ڈرامہ کر رہی ہے۔ اُس عورت کا مرد جس کے لیے جان دے چکا تھا وہ بڑے آرام سے اپنے گھر میں بیٹھا اس کے مرد کے خون کا الزام وشال پر لگانے کی سازش کر رہا تھا۔ وشال نے سوچا کہ اپنے لختِ جگر کی دوائی خریدنے کے لیے اس عورت نے ایک بار اپنی عزت دی ہے، دوسری بار کیا اُسے اپنے لخت

جگر کا کفن خریدنے کے لیے اپنی عزت دینی ہوگی؟ کیسی ہے یہ دنیا؟۔ یہ سوچ کر وہ رو پڑا لیکن پھر اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ مصیبت اور دکھ کی اِس گھڑی میں اُس مجبور عورت کو دوبارہ برہنہ نہ ہونے دے گا۔ وہ فوراً ہی اپنے گھر کی طرف دوڑا۔ اُس کے پاس ایسی کوئی چیز نہ تھی کہ جس سے وہ شودت کی بیوہ کو اسکے بچے کا کفن لا دیتا۔ سب کچھ تو بٹوارے کے بہانے اس کا بھائی لے گیا تھا صرف ایک کلاک تھا جو ایک بار ممتا نے اُسے اُس کے جنم دن پر تحفے میں دیا تھا اور جس کو اُس کا بھائی شاید اسلئے گھر میں چھوڑ گیا تھا کہ وہ ان کے باپ کی جائیداد میں شامل نہ تھی۔ ممتا کے دئے ہوئے کلاک کو وہ بازار میں ہرگز نہ دینا چاہتا تھا لیکن پھر اُس نے سوچا کہ اگر اس نے وہ کلاک نہ دیا تو ایک عورت پھر سے لٹ جائے گی۔ جمہوریت پہلے ہی بہت ہی رو چکی ہے۔ اُس نے وہ کلاک نہ دیا تو پھر سے رونا ہوگا جمہوریت کو۔ ممتا کے تحفے سے بڑھ کر اُسے شودت کی مجبور بیوہ کی عزت لگی تو وہ فوراً اُس کلاک کو بازار میں لے آیا۔ اتفاق سے وہ جس دوکان پر اُس کلاک کو فروخت کرنے گیا۔ اُس دوکان پر اُس کا سامنا نوین سے ہوا۔ نوین بولا۔

"یہ کلاک چوری کا تو نہیں ہے؟"۔

وشال نے غضب ناک آنکھوں سے اُسکی طرف دیکھا لیکن اُس وقت اُس نے نوین کے منہ لگنا زیادہ مناسب نہ جانا کیونکہ وہ ایک بے بس عورت کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ نوین پھر بولا۔

"بہت جلدی میں ہو نا، اسلئے پوچھ رہا تھا۔"

"تمہارے گھر میں اگر چوری ہوئی ہے تو تم پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں لکھواتے ہو؟"۔

"میں تو رپورٹ لکھوائے بغیر ہی تمہیں جب چاہوں اندر کروا سکتا ہوں لیکن تمہیں میں کسی چھوٹے کیس میں اندر نہ کراؤں گا کوئی بڑا سا الزام لگوا کر اندر کرواؤں گا تا کہ کم از کم عمر قید کی سزا مل جائے تم کو۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم......؟"۔ وشال دوکاندار سے کلاک کے پیسے لیتے ہوئے نوین سے بولا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم کچھ بھی کروا سکتے ہو۔ ہوسکتا ہے کہ کل تم مجھے قتل کے کسی کیس

میں ہی پھانس لو۔''

نوین نے چونک کر اسکی طرف دیکھا۔ وشال بولا۔'' چناؤ کے دوران تم نے میرا اور شودت کا قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ میں تو کسی طرح بچ گیا لیکن شودت کا قتل تم نے ہی کروا ہی دیا۔ اب اُسی کے قتل کے الزام میں تم موہن بابو کے ساتھ مل کر مجھے پھانس لینے کی سازش کر رہے ہو، سچ ہے نا؟۔''

''شٹ اپ''

''میں ذرا جلدی میں ہوں ورنہ تمہاری شٹ اپ کا جواب بھی تم کو دیتا۔''

''تم بہت زیادہ باتیں سیکھ گئے ہو۔''

''تم جیسے سیاست دانوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کا نتیجہ ہے یہ۔''

''ہم جیسے سیاست دانوں سے یہی بس یہی سیکھا ہے تم نے؟ یہ نہیں سیکھا کہ ہم کیسے اپنے دشمنوں کے پر کاٹ لیتے ہیں؟۔''

''سیکھا ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔'' سب کچھ سیکھا ہے اور افسوس مجھے تم جیسے سیاست دانوں پر ہو رہا ہے جنہوں نے مجھے یہ سب سکھایا ہے۔ اُن سے سیکھی ہوئی ہر بات اُن پر آزما سکتا ہوں میں۔ معلوم ہے شودت کے قتل کے سلسلے میں مجھے تم لوگ پھانسنے کی جو سازش کر رہے ہو وہ تم لوگوں کو بہت مہنگی ثابت ہوگی۔

''کیا کرو گے تم؟'' نوین سے غصے سے پوچھا۔''

''مجھے شودت کے قتل کے جرم میں پھانسی ہوگی لیکن پھانسی ہونے سے پہلے تم لوگوں کا میں قتلِ عام کروں گا کیونکہ ایک خون کی سزا بھی پھانسی ہے اور چار خون کرنے کی سزا بھی پھانسی ہی ہے۔'' وہ تیزی سے وہاں سے چل دیا۔ تھوڑی دیر میں اُس نے سارے پیسے شودت کی بیوہ کی جھولی میں ڈال دیئے۔ اُس نے سر اُٹھا کر نم ناک آنکھوں سے وشال کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔''

''اب تم اپنی جھونپڑی میں جاؤ۔ یہاں تمہیں کوئی کچھ نہ دے گا۔''

''اب اور کیا چاہیئے مجھے؟'' وہ تھکی سی، ٹوٹی سی، بکھری سی اپنی ہچکیوں کے درمیان بولی۔''تم نے آکر تو سب کچھ دے دیا ہے مجھے۔''

''کچھ بھی نہیں ہے یہ''۔

''اس سے میرے بچے کا کفن تو آئے گا لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ سب مجھے دے کر تم خود بھوکے رہ گئے ہو۔'' وہ بہت جذباتی ہو گئی تھی۔ دنیا میں بہت کم لوگ تم جیسے ہوں گے۔

تبھی آس پاس جمع شدہ لوگوں میں سے ایک نوجوان بڑی شوخی سے بولا۔''عشق کا بھوت جو سوار ہے تم پر اس لیے کوئی دوسرا اس جیسا کیسے لگے گا؟''

وشال نے گھوم کر دیکھا تو سب کچھ جان گیا۔ جس نوجوان نے وہ فقرہ کسا تھا اُس کی بغل میں کھڑا نوین مسکرا رہا تھا۔ وشال کا جی چاہا کہ نوین سے اگلا پچھلا ہر حساب کر لے لیکن تبھی دوسرا نوجوان بولا۔

''اچھا تو لگ ہی رہا ہے وہ اُس نے کچھ دیا ہے تو سود سمیت وصول بھی کرے گا۔

''ہاں بھائی''۔ ایک اور بولا۔ ''دینے والا نوجوان ہے اور لینے والی خوبصورت

''اسی لیے تو دینے والا بڑی خوشی سے دے گیا ہے۔''

برداشت کرتے بہت دیر ہو گئی تھی۔ اب وشال سے یہ سب برداشت نہ ہو سکا۔ اس کے غصے کی کوئی حد نہ رہی جو خود نیکی نہیں کر سکتے ہیں وہ دوسروں کو بھی نیکی کرتے نہیں دیکھ سکتے ہیں اور ایسے گھناونے الزام لگا دیتے ہیں۔ الزام لگاتے وقت یہ بھی نہیں سوچتے کی اگلے کی حالت کیا ہے؟ دراصل یہ سماج ہی ایسا بن گیا ہے کہ یہاں ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان کسی بھی رشتے کو شک کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے چاہئے رشتہ خون کا ہو، انسانیت کا ہو یا پھر ہمدردی کا ہو۔ وشال کے غصے کی کوئی حد نہ رہی۔ وہ فوراً پلٹ گیا۔ ہوا میں اُن کا ہاتھ لہرایا اور ایک نوجوان کے چہرے پر لگا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہنگامہ ہو گیا۔ اُسے کچھ بھی نہ پتہ چل سکا کہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ پٹ رہا تھا۔ زخمی ہو رہا تھا۔ لہولہان ہو رہا تھا اور وہ اپنے بچاؤ میں کچھ بھی نہ کر پا رہا تھا۔ نوین فٹ پاتھ پر اطمینان سے کھڑا سگریٹ پیتے ہوئے مسکرا رہا تھا اور اس کے شیطانی فوجی اپنی بربریت کا کھیل آزادی سے کھیلے جا رہے تھے۔ پھر نہ جانے کہاں سے، کس کے بلانے سے اور کیسے پولیس آ گئی؟ اُسے مارتے ہوئے ہاتھ رُک گئے۔ وہ مجروح اور فگار بڑی مشکل سے کھڑا ہو گیا۔ بس اپنا بکھرا ہوا لہو لہان جسم سمیٹتے ہوئے وہ فریاد کرتے ہوئے بولنے ہی لگا تھا کہ پولیس والوں کے ہاتھ

چلے۔ ہاتھوں میں رکھے ہوئے مضبوط بانس چلے جو سب اُسی کو لگے۔ اُسے مارنے والے ایک طرف نوین کے ساتھ کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ محافظ بھی لوٹنے لگے کیا کیا جا سکتا ہے؟ سمجھ میں نہیں آیا کہ قانون کے رکھوالے ہیں یا کسی کے زرِ خرید غلام؟ زخمی وہ نوین کے آدمیوں کے ہاتھوں پہلے ہی ہو گیا تھا، پولیس کے ڈنڈوں سے وہ ٹوٹ گیا۔ اُس میں کوئی ہمت نہ رہی اور پولیس اُسے مارتی ہوئی، گھسیٹتی ہوئی گاڑی میں بٹھا کر لے گئی۔ جمع شدہ لوگوں میں کوئی پولیس کی اس بے تکی زیادتی کے خلاف بولنے کی ہمت نہ کر سکا۔ ہاں اُس کی بھیگی ہوئی آنکھوں کے سامنے اپنی گود میں اپنے معصوم بیٹے کی لاش لیے شودت کی بیوہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختی رہی۔

''اے بابو، اے افسر۔ یہ بے گناہ ہے۔ اس کا کوئی قصور نہیں۔ یہ تو دیوتا ہے، بے گناہ ہے۔''

پولیس کی گاڑی اُسے وہاں سے لے کر نکل گئی۔ وہ اپنے زخموں سے بہتے ہوئے لہو کو دیکھتے ہوئے اور شودت کی بیوہ کی ساری ان سُنی فریادیں سنتے ہوئے صرف یہ سوچتا رہا کہ کاش ممتا سامنے ہوتی تو وہ اُسے بتا دیتا کہ آ ممتا اپنی آنکھوں سے دیکھ کہ دنیا میں کیا کیا ممکن ہے؟''

پولیس اسٹیشن میں بھی وہ لوگ اُسے مارتے پیٹتے اندر لے گئے۔ وہاں نوین پہلے سے ہی موجود تھا۔ وشال کو دیکھ کر وہ مسکرایا تو اس کی مسکراہٹ سے وشال کے اندر اور اس کے باہر کے زخموں سے بھی زیادہ درد ہوئی۔

''کون ہے یہ؟'' نوین نے انسپکٹر سے پوچھا۔

''موالی ہے۔ بدمعاش ہے۔ لوفر ہے، سالا دلال ہے۔''

وشال کی آنکھوں میں آنسوں بھر آئے کیونکہ مار اُس نے سہی تھی۔ یہ گھناونے لفظ وہ نہ سہہ سکا تھا۔ موالی، بدمعاش، لوفر، سالا، دلال۔ اُس نے سوچا کہ اس سماج میں ایک عام آدمی کو انصاف نہیں مل سکتا ہے۔ دراصل یہ نظام ایک پرانا اور بے مطلب ہو گیا ہے۔ اس میں ایک تبدیلی چاہیئے ہوگی ورنہ انصاف کی امید کرنا فضول ہے۔ وہ خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہا یہاں تک کہ اُن سارے الزاموں کے خلاف اُس نے زبان نہیں کھولی۔ تھوڑی ہی

دیر میں وہ لاک اپ میں بند ہو گیا۔ تب بھی وہ اپنی آنکھوں میں آنسوں لیے یہی سوچتا رہا کہ کاش ممتا سامنے ہوتی تو وہ اُسے بتا دیتا کہ دیکھ ممتا دنیا میں کیا کیا ممکن ہے؟۔''

کچھ دیر میں کچھ پولیس والے اس کے پاس چلے آئے اور وہ اس سے شودت کی بیوہ کے ساتھ اُس کے رشتوں کے بارے میں پوچھنے لگے۔ اُس نے جو بھی جواب دیا وہ اُس سے مطمئن نہ ہوئے یا پھر انہوں نے مطمئن ہو جانے کا بہانہ بنا دیا اور اُسی بہانے وہ اس کی پٹائی کرنے لگے۔ پتھر پر بھی چوٹ مارتے رہو تو وہ بھی ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ وشال بھی ٹوٹنے لگا۔

''آپ مجھ سے کیا قبول کروانا چاہتے ہیں۔'' وہ چیخ پڑا۔

''یہ کہ وہ تمہاری کیا لگتی ہے؟ کیا رشتہ ہے تمہارا اُس کے ساتھ؟۔''

''میرا اُس عورت کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں نے اُس کی مدد کی ہے تا کہ وہ اپنے بچے کا کفن خرید سکے۔ وہ شودت کی بیوہ نہ ہوتی کوئی دوسری عورت بھی ہوتی تب بھی میں اُس کی مدد ضرور کرتا۔''

شاید اس کی بات انہوں نے تسلیم کی تھی یا پھر وہ یہ سمجھ گئے تھے کہ نوین کے کہنے کے مطابق اُس کی پوری پٹائی ہو گئی ہے۔ وہ اُسے چھوڑ کر نکل گئے۔ رات بھر وہ تھانے میں رہا۔ رات بھر وہ روتا رہا۔ رات بھر وہ بھوکا رہا۔ رات بھر اُس کے ذہن میں ایک کھلبلی مچی رہی۔ رات بھر وہ سوچتا رہا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے؟ رات بھر شودت کی بیوہ کی باتیں اُس کے کانوں میں گونجتی رہی۔

''بہت بزدل ہو تم۔ اس طرح ٹوٹ کر مر جانے سے اچھا ہے کہ وہ لوٹ لو جو تمہیں نہیں مل رہا ہے یا پھر اُس کو مارو جو تم سے کچھ چھین رہا ہے۔ کم از کم باقی لوگوں کے لیے کچھ سبق تو چھوڑ کر جاؤ گے۔ میں عورت ہوں، کمزور ہوں لیکن تم تو مرد ہو اور وہ بھی جوان۔ شرافت سے روٹی نہ حاصل ہو تو لوٹ کر حاصل کر لو کیونکہ ہر کوئی لوٹ رہا ہے۔ کوئی روٹی لوٹ رہا ہے تو کوئی عورت لوٹ رہا ہے۔

لاک اپ میں بند اپنے بے حساب زخموں کے بے پناہ درد سے ٹوٹتے ہوئے اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب شرافت چھوڑ دے گا کیونکہ اب آگے شرافت سے وہ جی نہ سکے گا۔ اُس

نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی لوٹ کا راستہ اپنائے گا لیکن وہ لوٹے گا تو اُن کو لوٹے گا جو غریبوں کو لوٹ لیتے ہیں۔ چاہئے اس کے لیے اسے ہتھیار اُٹھا کر کسی کا قتل بھی کیوں نہ کرنا پڑے؟۔''

اُس نے لاک اپ کی سلاخوں کو دیکھا۔ من ہی من میں اُس نے سوچا کہ بس ان سلاخوں کے کھلنے کی دیر ہے۔ وہ صرف گپتا جی کو نہیں، صرف نوین کو نہیں، صرف موہن کو بابو نہیں بلکہ سماج میں پل رہے ہر چھوٹے بڑے شیطان کو اپنے سامنے جھکا دے گا چاہئے دُنیا اسے پھر قاتل کہے، لوفر کہے، بدمعاش کہے، دلال کہے، موالی کہے یا پھر کوئی اور نام دے۔ یہی فیصلہ کر کے وہ اپنی آنکھیں بند کر کے اونگھنے لگا۔

صبح جانے کس کام سے موہن بابو تھانے میں چلے آئے جہاں انہوں نے وشال کو دیکھا۔ وشال نے اُن سے کچھ نہیں کہا کوئی فریاد نہ کی لیکن وہ اُسے چھڑا کر لے گئے۔ وہ موہن بابو کا یہ احسان نہ لینا چاہتا تھا لیکن پھر اُسے تھانے سے نکلنے کی ضرورت بھی تھی۔ وہ چپ چاپ اُن کے ساتھ ہولیا۔ کار میں جاتے ہوئے انہوں نے وشال کے جسم کا جائزہ لیا۔ بولے۔

''بہت زخمی ہو گئے ہو تم۔''

وشال نے اپنے زخموں کی طرف دیکھا۔ بولا۔ ''نہیں بہت معمولی زخم ہیں یہ۔''

''کس سے لڑے تھے؟۔''

''بے ہودگی اور درندگی سے۔''

''اور مار کھا گئے۔''

''ہاں''

''درد ہو رہی ہے کیا؟۔''

ان زخموں سے نہیں ہاں اندر کچھ بڑے بڑے گھاؤ ہیں جو بہت درد کر رہے ہیں

''بہت جلد ہمت ہارنے لگے ہو۔''

''بہت جلدی نہیں، بہت دیر میں ہمت ہار گیا ہوں میں لیکن اتنی بھی ہمت نہ ہار گیا ہوں کہ میں ان زخموں کا اور ان کے درد کا علاج نہ ڈھونڈ سکوں۔''

''کوئی علاج سوجھ بھی گیا ہے کیا؟۔''

''ہاں''۔

''کون سا؟''۔

''شرافت نہیں، ایمانداری نہیں، حق کی تلاش نہیں، رشوت کا لالچ نہیں، بے ایمانی نہیں، جھوٹ نہیں، سچ نہیں۔ سفارش کی ضرورت نہیں۔ اس سب کا علاج بندوق ہے۔''

''بندوق......؟ موہن بابو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔''

''ہاں بندوق''۔ وہ فوراً بولا۔ جو گرجتی ہے اور جس کے آگے سب سر جھکاتے ہیں جس سے سب خوف کھاتے ہیں۔ میری سمجھ میں اب آ گیا ہے کہ یہاں شرافت اور ایمانداری سے جینے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔ یہاں حق کی امید اور تلاش کرنا فضول ہے۔ یہاں ڈگری تو ہاتھ میں دی جاتی ہے لیکن اُس ڈگری کی اہمیت کو کوئی تسلیم نہیں کرتا ہے۔ یہاں بڑے بڑے امتحان لیے جاتے ہیں لیکن اپنے بل پر اُن میں کامیاب ہونے والوں سے رشوت مانگی جاتی ہے۔ جو رشوت دے پاتا ہے اُسے نوکری مل جاتی ہے تو لوگ اُسے ہونہار کہہ دیتے ہیں اور جو رشوت نہیں دے پاتا ہے اُسے نوکری بھی نہیں ملتی ہے اور اُسے ناکارہ اور نالائق بھی قرار دیا جاتا ہے۔ وہ کہتا جا رہا تھا اور موہن بابو اسے سنتے جا رہے تھے۔ وہ پھر بولا۔ ''یہاں شودت کو قتل کیا جاتا ہے اور قتل کا الزام کسی بے گناہ کے سر لگانے کی سازش کی جاتی ہے۔ یہاں شودت کے قتل کے بعد شودت کی بیوہ اپنے رہنما سے کسی مدد کو جاتی ہے تو اسے اسکے مرد کی قتل کی جھوٹی کہانی سنا کر قاتل کا نام بھی بتایا جاتا ہے تا کہ وہ اُس سے بدلہ لے سکے۔ اُسے دس ہزار روپے کا لالچ بھی دیا جاتا ہے کہ وہ اُس کی فرضی قاتل کے خلاف عدالت میں گواہی دے۔ آپ کو پسینے کیوں آ رہے ہیں؟'' اُس نے ایک دم پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ جلدی پسینہ صاف کرتے ہوئے بولے۔ ''تھوڑی گرمی لگ رہی ہے۔''

وشال مسکرایا۔ بولا ''اتنی تو گرمی نہیں ہے۔''

''تمہیں نہ لگتی ہو، مجھے لگتی ہے۔''

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ شودت کی بیوہ کو دس ہزار روپئے کا لالچ دیا جاتا ہے۔ قتل کی جھوٹی کہانی اور قاتل کا نام سناتے وقت یہ بھی نہ سوچا جاتا ہے کہ وہ آدمی جسکے خلاف سازش کی جا رہی

ہے۔ کسی کے لیے کتنے بڑے کام کر گیا ہے؟۔ یہاں شودت جیسے مظلوم آدمی کی مجبور بیوہ کے مرے ہوئے بچے کے کفن کے لیے پیسے دینے والے کو بھرے بازار میں مارا پیٹا جاتا ہے اور اسے تھانے پہنچا کر لاک اپ میں بند کیا جاتا ہے اور اسے موالی، بدمعاش، لوفر، سالا اور دلال کہا جاتا ہے۔ یہاں چناؤ کے دوران لوگوں کو لڑانے اور مارنے والے چناؤ کے بعد آپس میں گٹھ جوڑ کر کے نہ صرف لوگوں کے گھر برباد کرتے ہیں بلکہ لوگوں کی خوشیوں کی دلالی بھی کرتے ہیں۔ یہاں حق، سچائی اور اصولوں کی بات کرنے والے بھی رشوت لیتے وقت نہیں شرماتے ہیں تو پھر میرے جیسے ایک غریب، مظلوم، مجبور اور عام آدمی کو بندوق اُٹھائے بغیر انصاف کہاں سے مل سکتا ہے؟۔"

وشال موہن بابو سے سب کچھ کہہ چکا تھا۔ وہ کچھ ڈرے ہوئے لگ رہے تھے۔ بولے۔ "تمہارا مطلب ہے کہ حق اور انصاف حاصل کرنے کے لیے تم قانون ہاتھ میں لوگے؟۔"

"اس کے سوا چارہ کیا ہے۔"

"تو......تو تم دہشت پسند بنو گے؟۔"

"بننا پڑے گا۔ تبھی کچھ حاصل ہوگا۔ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ دہشت پسندوں کو سب کچھ ملتا ہے۔ جب تک گرفتار نہیں ہوتے ہیں جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ گرفتاری کے بعد بھی جیل میں ان کو ہر سہولیات ملتی ہے۔ پھر ایسا بن جانے میں حرج بھی کیا ہے؟۔ میرے سے پہلے یہاں بہت عزت دار لوگ بھی جانے کیا کیا بنے ہوئے ہیں۔ اُجلے اُجلے لباس پہن کر وہ ہر کالا کام کرتے ہیں لیکن اپنا حق مانگنے والوں کو دہشت پسند کہتے ہیں۔ شودت کا قتل ہوا تو کچھ دن سب نے شور مچایا لیکن اُس کو قتل کرنے والے گپتا جی اور نوین کو کسی نے دہشت پسند نہیں کہا۔ آپ نے بھی نہیں، دراصل دہشت پسند کو دہشت پسند نہ کہنے والا بھی دہشت پسند ہے۔"

"شٹ اپ۔"

"غصہ نہ کریئے موہن بابو۔ میں آپ کی بات کہاں کر رہا ہوں؟۔ یہاں سبھی ایسے ہیں اور اُن کو سب کی وجہ سے میری جوانی کے اتنے بہترین سال ضائع ہوئے ہیں جو پورا بھارت اور پورے بھارت کا نظام بھی مجھے لوٹا نہیں سکتا ہے۔"

"بھارت کے نظام میں اس کا کیا قصور ہے؟۔"

''قصور ہے۔'' وہ فوراً بولا۔ ''کیونکہ اس میں اصلی قاتلوں، اصلی گنہگاروں، رشوت خوروں اور مطلب پرست گندھے سیاست دانوں کو ان کے جرموں کی سزا دلوانے کی گنجائش نہیں ہے اور اگر ہے تو صرف کاغذوں میں ہے اسی لیے عام آدمی پھر اُن کے قتل وغارت پر اُتر جاتا ہے۔ باقی کے سیاست دان اُن عام آدمیوں کو دہشت پسند کہتے ہیں لیکن اُن کی دہشت پسندی کی وجہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست دان عام آدمیوں کے ہاتھوں ہمیشہ مرتے رہے ہیں اور اب شاید میرے ہاتھوں بھی ایک دو مر جائیں۔''

''پھانسی ہوگی تمہیں۔''

''ڈرا رہے ہو آپ مجھے؟'' وہ اطمینان سے بولا۔ ''پھانسی ہوگی مجھے تو مروں گا لیکن بتائے اب بھی کون ساجی رہا ہوں میں؟۔ مروں گا تو خود بھی ان دُکھوں اور غموں سے نجات پاؤں گا اور دوسرے لوگوں کو بھی دو بڑے شیطانوں سے نجات دلاؤں گا۔''

موہن بابو کو اس پر کافی غصہ آ رہا تھا لیکن اندر ہی اندر وہ اس کے ارادوں سے ڈر بھی رہے تھے۔ انہوں نے اپنی کار رکوا دی۔ بولے۔ ''تمہارا گھر آ گیا ہے۔''

وہ کار سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔ ''بابو جی۔ سنا ہے کہ اسمبلی کے ٹوٹ جانے کا خطرہ ہے۔''

''ہاں۔ حالات کچھ ایسے ہی لگتے ہیں۔''

''تو پھر آپ کو پھر سے چناؤ لڑنا ہوگا۔''

''ہاں۔''

''اور آپ دوبارہ بھی کامیاب ہونا چاہیں گے؟''

''ہاں کیوں نہیں اور تمہارے ہوتے تو میری کامیابی یقینی ہے۔''

''یہی یاد دلانا چاہتا تھا میں آپ کو۔'' وہ فوراً بولا۔ ''آپ کی جیت ہم لوگوں کے ہوتے ہی ہو سکتی ہے ویسے آپ ہار بھی گئے تو کیا غم ہے؟۔''

''کیا مطلب....؟۔''

''مطلب یہ کہ چناؤ سے پہلے آپ کے پاس ایک پرانی سی سائیکل تھی۔ آج کار آ گئی

ہے اور کوٹھی پر بھی کام بہت تیزی سے چل رہا ہے۔ بہت پیسہ کمایا آپ نے۔"

"شٹ اپ"

"بار بار غصہ کیوں ہو جاتے ہیں آپ؟ بلڈ پریشر Blood pressure بڑھ جائے گا آپ کا۔ ویسے بھی ایسا کرتے ہیں۔ آپ نے بھی کیا تو کیا بُرا کیا؟ میں نے بھی یہی کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو کیا بُرا کیا ہے۔ فرق صرف اتنا کہ آپ نے چالاکی سے کیا میں بندوق کے زور سے کرنے جا رہا ہوں۔

"بہت بُرا انجام ہوگا تمہارا۔"

"میرا انجام تو بعد میں دیکھا جائے گا لیکن اُس سے پہلے میں کس کس کا بُرا انجام کرتا ہوں، کیا معلوم؟ موہن بابو کے اشارے سے اُن کا ڈرائیور کار کو وہاں سے لے چلا تو وشال اُن کو وہاں سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اُس کو چناؤ سے پہلے کے دن یاد آئے جب دھوپ اور برسات میں یکساں طور موہن بابو اپنی سائیکل کھینچا کرتے تھے۔ تب اُن کی سانس دھیمی دھیمی سی پھولی سی رہتی تھی اور آج وہ اتنی مہنگی کار میں بڑے آرام سے گھومتے ہیں۔ وشال نے سوچا کہ پیسے کمانے کا سب سے آسان طریقہ یہ سیاست اور یہ چناؤ ہیں۔ جو جیتا وہ سکندر بن گیا۔ ہار بھی گیا تو گھر کا کیا گیا لوگوں کا دیا ہوا پیسہ ہی اُڑ گیا۔

رات میں ہی اُس نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر اُسے جینا ہے تو بندوق کے سہارے ہی جینا ہے ورنہ غریبی، بے کاری اور اُس کے دشمن اُسے چین سے جینے نہ دیں گے۔ اُس نے سوچا کہ بندوق کے سُہارے وہ نہ صرف اپنی روٹی حاصل کرے گا بلکہ دوسرے مجبوروں اور بے بسوں کا سُہارا بھی بنے گا اور تمام ظالموں کا صفایا بھی کرے گا۔ وہ کسی کو شودت کی طرح مرنے نہ دے گا اور اگر کوئی شودت کی طرح مر بھی گیا تو وہ اس کی بیوہ کو جسم فروشی نہ کرنے دے گا۔ وہ کسی مرے ہوئے آدمی کو کفن کے لیے انتظار نہ کرنے دے گا۔ وہ تیزی سے پلٹ کر مکت لعل سے ملنے چلا جو اُسے اپنا چیلا بنا کر بندوق دے سکتا تھا۔ طاقت دے سکتا تھا لیکن تبھی اُسے اس کا دوست روی ملا۔ روی نے اُسے زخمی حالت میں دیکھا۔ تو اُس کے چاہئے نہ چاہتے اُسے اپنے گھر لے گیا۔ اُسے فسٹ ایڈ First Aid دے کر اُسے ناشتہ کرایا اور اُسنے اس کے زخمی ہونے کی وجہ پوچھی۔ وشال نے اُسے اپنی پوری

گزری سُنائی تو وہ بولا۔

"ہاں وشال، زمانہ بہت خراب ہوگیا ہے۔ لیکن افسوس کہ ان حالات کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہے۔"

"نہ ہے تو کیا ہوا؟ میں ہو جاؤں گا۔"

"تم......؟"

"ہاں روی۔ اقبال نے کہا ہے۔

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

"ہمارے سماج کی حالت بہت خراب ہوگئی ہے اور ہم میں سے کسی نہ کسی کو یہ حالت بدلنے کے لیے آگے ضرور آنا ہوگا اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ سماج کے ظالم لٹیروں کا خاتمہ میں کروں گا۔ جب ہمیں ہمارا حق نہیں مل رہا ہے تب ہمیں ہمارا حق لوٹ لینے والوں کو ہی ختم کرنا چاہئے ورنہ آنے والے دنوں میں وہ لٹیرے شاید عام لوگوں سے اُن کی سانسیں بھی چھین لیں گے۔ اس لیے میں مکت لعل سے ملنے جا رہا تھا کہ تم مجھے یہاں لے آئے۔"

روی کو اُس کا یہ فیصلہ کچھ جائز بھی لگا تو کچھ ناجائز بھی۔ پڑھائی کے بعد کچھ دیر روی بھی بے روزگار رہا تھا اور اُن چند مہینوں میں اُس کے ساتھ جو کچھ بھی گزری تھی اُس سے وہ وشال کی حالت کا اندازہ لگا سکتا تھا لیکن پھر ذرا وشال کے اس فیصلے کے ہر پہلو پر غور کر کے اُس نے سوچا کہ اس کا انجام تو بہت بُرا ہوگا۔ ایسا ہی مکت لعل نے بھی کیا تھا کیونکہ کسی بڑے آدمی نے اُس کی بیوی کی عزت لوٹی تھی۔ اُس کی بیوی کی خوبصورتی بہت دور دور تک مشہور تھی لیکن وہ بہت ہی نیک اور شریف عورت تھی۔ شکاری کا کوئی بھی دانہ اُسے پھانس نہ سکا تو شکاری نے جال پھینکا اور اُسے زبردستی اُٹھا کے لے گیا۔ وہ عورت بہادر تھی لیکن تھی تو عورت۔ اس نے سماج میں اُس حالت میں رہنے کے بدلے پھانسی لی لیکن پھانسی لینے سے پہلے اُس نے اُس بڑے آدمی کی پول کھول دی۔ بات نہ صرف پولیس تک پہنچی بلکہ عدالت تک بھی پہنچی جہاں گواہی نہ ملنے کی وجہ سے مکت لعل کی عورت اُس بڑے آدمی کا جرم ثابت

نہ کر سکی اور وہ بڑا آدمی باعزت چھوٹ گیا۔ مکت لعل کی بیوی نے پھانسی لی کیونکہ اُسے انصاف نہ ملا تھا لیکن مکت لعل نے اپنی بیوی کو انصاف دلوایا۔ جانے کیسے کہاں سے ایک بندوق حاصل کر کے اُس نے اپنی بیوی کے گنہگار کو موت کی نیند سلا دیا اور خود فرار ہو گیا۔ پولیس پیچھے پڑ گئی تو اُس نے جنگلوں میں پناہ لی۔ جنگلوں میں اُسے اپنے جیسے کئی لوگ ملے۔ اُس نے سب کو اکٹھا کر دیا۔ ایک گروہ بنایا۔ تب سے کئی بار اس نے آس پاس کے گاؤں میں کئی مظلوموں کی مدد کرتے ہوئے ظالموں کی ناک میں دم کر دیا ہے۔ آج نہ صرف ظالم لوگ بلکہ پوری سرکار مکت لعل کے نام سے ڈرتی ہے اور آج بھی اُس کا گروہ بڑھتا جا رہا ہے۔ کیونکہ دنیا میں مظلوموں کی کمی نہیں ہے۔ روی نے سوچا کہ وشال مکت لعل سے ضرور اسلحہ اور مدد حاصل کرے گا لیکن پھر اُسے بھی جنگلوں میں پناہ لینی ہو گی یا پھر پولیس کی گولی کھانی ہو گی۔ وہ بولا۔

”میں جانتا ہوں وشال کہ تم نے کن حالات میں پڑھائی کی ہے؟ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم نے خوب محنت کر کے اپنے ہر امتحان میں اچھی کامیابی حاصل کی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم جب یونیورسٹی سے نکلے تھے تب تم نے نہ جانے کیا کیا خوبصورت سپنے دیکھے ہوں گے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آج تک تمہارا ایک بھی سپنا پورا نہ ہو سکا ہے لیکن اپنے سپنوں کو پورا کرنے کے لیے کیا تمہارے پاس یہی ایک طریقہ رہا ہے کہ تم ہاتھ میں بندوق لے کر جانے کس کس کا خون بہاؤ۔؟“

”لیکن یہ بہت ضروری بھی ہے۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ اس کے بغیر انصاف نہیں مل سکتا ہے۔“

”لیکن اپنے لیے انصاف حاصل کرنے کے لیے کیا تم جرم کرو گے؟“۔

”ہاں۔ کیونکہ یہ جرم کسی اچھے کام کے لیے ہو گا۔“

”لیکن جرم تو جرم ہی ہوتا ہے۔ چاہیے وہ کسی بھی وجہ سے کیا جائے یا کسی بھی بہانے سے کیا جائے۔ ذرا یہ تو سوچو کہ اس کا انجام کیا ہو گا؟“۔

”مجھے انجام کا کوئی غم نہیں ہے۔“

"ہر ایک کام کرنے سے پہلے آدمی کو اُس کام کے انجام کے بارے میں ضرور سوچنا چاہئے۔ ٹھیک ہے کہ تم کسی رشوت خور کو مارو گے اور ہو سکتا ہے کہ ایسا کرنے کے بعد چند ایک لوگ تمہاری سراہنا کریں گے لیکن کیا وہی لوگ تمہارے ساتھ جیل بھی جائیں گے اور کیا تمہارے ہاتھوں اُس رشوت خور کے مرجانے سے رشوت ختم ہو جائے گی؟۔ ہاں اتنا ضرور ہو گا کہ اُس رشوت خور کے مرجانے کے بعد اس کی بیوی بیوہ ہو جائے گی۔ اس کے بچے یتیم ہو جائیں گے اور تمام عمر تمہیں اُس بیوہ کی اور اُن یتیموں کی بددُعا لینا ہو گی اور کیا پتہ کل وہ یتیم بھی تمہاری طرح بندوق لے کر کھڑے ہو جائیں اور بندوق کے سہارے جو چاہیں کرتے پھریں۔ تم بندوق ہاتھ میں اُٹھاؤ گے تو جرم کرو گے۔ جرم کرو گے تو قانون کے مجرم بن جاؤ گے۔ مجرم بن جاؤ گے تو ابھی جو تمہیں نوکری مل جانے کی تھوڑی سی امید ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی بلکہ اُلٹے تم جیل میں چلے جاؤ گے۔ سوچو کہ اس سے ممتا پر کیا گزرے گی؟۔"

"ممتا......؟۔"

"ہاں ممتا......؟" روی فوراً بولا۔ تمہاری ممتا جس نے تم میں اپنا مسیحا، اپنا دوست، اپنا رکھوالا اور اپنا کیا کیا نہیں دیکھا ہے؟۔ تم نے بھی اُس کو ساتھ لے کر کیا کیا سپنے نہیں دیکھے ہیں؟ وہ تمہاری کتنی عزت اور پوجا کرتی ہے کیونکہ وہ تم کو اپنا دیوتا مانتی ہے لیکن کیا کسی کا خون کر کے تم اس کے ساتھ نظریں ملا سکو گے۔؟

"تھوڑی دیر کے لیے وہ گھبرا سا گیا" لیکن پھر سنبھل کر بولا۔ "اب اُس کے ساتھ نظریں کیا ملانی؟ میں پہلے ہی اُسے خود سے الگ کر چکا ہوں، اُسے یہ کہہ چکا ہوں کہ وہ کسی کے شادی کر کے اپنا گھر بسائے۔"

"اوہ نو......"۔

"ہاں"

روی کو یہ سن کر بہت دکھ ہوا لیکن وہ یقین نہ کر پایا کہ ممتا ایسا کر سکے گی۔ اُسے معلوم تھا کہ ممتا ایک پُجارن ہے اور وہ اپنے دیوتا کی پوجا نہیں چھوڑ سکتی ہے۔ وہ بولا۔ تم نے زندگی کے غموں اور دکھوں سے گھبرا کر شاید اُسے یہ سب کہہ بھی لیا ہو لیکن تم نے کیسے مان لیا کہ محبت

کی وہ بیچارن ایسا کرے گی؟"

"اُس کے کرنے نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے جب میں ہی اس کے پیار کے قابل خود کو نہیں سمجھتا ہوں۔"

"یہ بھی تمہاری غلطی ہے۔ وہ فوراً بولا۔ تم اس کے قابل کیوں نہیں ہو؟ کیا صرف اس لیے کہ تم بے روزگار ہو؟ اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟ اگر تم نے اُسے کچھ ایسا کہا بھی ہے تو جا کے اُسے معافی مانگ لو کیونکہ اس کا دل دکھا کر تم خود بھی خوش نہ رہ سکو گے؟ وہ تمہاری منزل ہے۔ تم خود کو اُس کے قابل نہیں سمجھتے ہو لیکن وہ تو ایسا نہیں مانتی ہے۔ وہ تو تمہاری پوجا کرتی ہے۔ دیکھو، کتنے سالوں سے وہ تمہارے لیے بیٹھی ہے؟ کیونکہ تم اُس کی آنکھوں کا ایک اکیلا سپنا ہو۔ وہ سپنا پورا کرنے کے لیے جانے وہ کتنی بار کن حالات سے گزری ہوگی اور تم اُس کی زندگی بھر کی عبادت کو بس یہ کہہ کر ختم کر رہے ہو کہ تم اُس کے قابل نہ ہو۔"

"لیکن یہ بھی ایک سچ ہے۔"

"نہیں یہ سچ نہیں ہے۔" وہ فوراً بولا۔ "سچ تو یہ ہے کہ تم ایک بہت ہی اچھے آدمی جس کو ذراسی بدنصیبی نے مارا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تمہیں کسی کے ذراسی سہارے کی ضرورت ہے اور تمہیں وہ سہارا ملے تو تم بہت آگے جا سکتے ہو اور سچ یہ ہے کہ تم نے ہمت ہاری ہے۔ یہ دیکھو" وہ پاس ہی پڑا ہوا ایک اخبار اُسے دکھاتے ہوئے بولا۔ "اس اخبار میں ایک اور امتحان کا اشتہار چھپا ہوا ہے۔ اس بار اسامیاں بھی بہت ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے پہلے ہی ایسے امتحان پاس کیے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اس بار بھی تم امتحان پاس کرو گے اور ہو سکتا ہے کہ اس بار تمہیں نوکری بھی ملے۔ اس لیے ایک بار اور سہی۔ اپنے لیے نہ سہی، کم از کم ممتا کے لیے ایک بار اور کوشش کرو۔"

"اب کیا فائدہ ہے؟۔ اب تو ممتا نے نوین کے ساتھ شادی کرنے کے لیے ہاں بھی کہہ دی ہوگی۔ اب میں اس کوشش میں کامیاب بھی ہوا تب بھی ممتا مجھے نہ ملے گی۔"

"میرا دل کہتا ہے کہ اتنی جلدی اُس نے ایسا نہ کیا ہوگا۔ تم بیٹھو۔ میں فون پر اس بات کا پتہ کر کے آتا ہوں۔ وہ ممتا کو فون کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں چل دیا تو وشال نے اخبار میں چھپی وہ اشتہار پڑھی تو اچانک ہی ایک زوردار خیال اس کے ذہن میں آیا اور

اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور آنکھوں میں چمک کیونکہ اُس اشتہار کے آخر میں لکھا تھا کہ جسمانی طور معذور لوگوں کے لیے چار اسامیاں مخصوص ہیں۔ اُس نے سوچا کہ جسمانی طور پر خود کو معذور کر کے اُسے یہ نوکری آسانی سے مل سکتی ہے لیکن خود کو جسمانی طور پر معذور کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ وہ اندر ہی اندر اس تصور کا خوف کھانے لگا لیکن اُس نے سوچا کہ بندوق اُٹھا کر دوسروں کی جان لے کر یا دوسروں کو جسمانی طور ناکارہ بنا کر روٹی کی تلاش کرنے سے اچھا ہے کہ خود کو ہی ناکارہ بنایا جائے۔ کم از کم خونی بن کر جیل جانے سے، عمر قید کی سزا پانے سے یا پھانسی پر لٹکنے سے اور دوسروں کی بد دعاؤں سے تو محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ یہ اُسے اس لحاظ سے بھی اچھا لگا کہ ایسا کر کے کم از کم اُسے روٹی تو ملے گی اور اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو اُسے ممتا تو دور کی بات روٹی بھی نہ ملے گی۔ اُس نے سوچا کہ ممتا اس کے لیے ضروری ہے، روٹی بھی اس کے لیے ضروری ہے اُسے یہ دونوں ہی چیزیں چاہیے۔ وہ کوئی ٹھوس قدم نہ اُٹھائے گا تو وہ دونوں کو کھو جائے گا۔ وہ کچھ کرے گا تو کم از کم ایک چیز تو اُسے ملے گی اُس ایک چیز کے ملتے شاید دوسری چیز بھی اُسے مل جائے۔ اُسے ایک چیز نہ ملی تو دوسری چیز کو پانے کی اُمید بھی وہ نہیں کر سکتا ہے۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ روی نے آ کر اُسے اطلاع دی کہ ممتا نے اُسے اپنے گھر کے باہر فوراً بلایا ہے۔ وشال سوچ میں پڑ گیا۔ روی نے پوچھا۔

"اب کیا سوچنے لگے۔"

"کچھ نہیں۔"

"تم نے تو ایک جھٹکے میں خود کو اُسے الگ کر دیا تھا لیکن اس کے لیے تو یہ بندھن شاید سانس برابر قیمت رکھتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"ہاں اور اب جا کر اُسے ملو۔ اُسے سہلاو۔ بہت روتی رہی ہوگی وہ۔"

ممتا پہلے ہی اپنے گھر کے باہر اُس کے انتظار میں تھی۔ وشال اُس سے نظریں نہ ملا سکا۔ بس خاموشی سے نظریں جھکائے اُس کے سامنے کھڑا ہوا۔ وہ کچھ دیر تک اُسے دیکھتی رہی۔ دھیرے دھیرے اُس کی آنکھوں کے تالاب بھرتے گئے۔ لگا ابھی وہ تالاب پوری

طرح بھر کر اپنے باندھ توڑ دیں گے۔ وہ بولی۔

’’آ گئے تم......؟‘‘۔

’’ہہ.........ہاں‘‘۔

’’تم تو مجھے راستے پر ہی چھوڑ کر چل دیئے تھے‘‘۔

’’I am sorry‘‘ لیکن میں نے لوٹ آنے میں دیر نہ کی‘‘۔

’’جلدی لوٹ آئے؟‘‘ وہ زبردستی اپنے آنسوں روکتے ہوئی بولی۔ تم نے تو صدیاں گزار دیں لوٹ آنے میں اور کہتے ہو کہ تم نے لوٹ آنے میں دیر نہ کی؟‘‘۔

’’مجھے معلوم ہے ممتا کہ یہ وقت تم نے بڑی مشکل سے گزارا ہوگا۔ مجھے معاف کرنا ممتا۔ دراصل کئی دنوں سے میں بہت پریشان تھا اور میری پریشانی تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔ تم جانتی ہو کہ اپنی زندگی کے راستوں پر اُجالا کرنے کے لیے میں نے خالی دیے اپنے لہو سے بھی بھر دیئے لیکن میرے راستوں پر پھر بھی اُجالا نہ ہو سکا۔ میں نے سوچا کہ شاید اُجالے میرے نصیب میں نہیں ہیں ہی نہیں اس لیے میں نے تم سے وہ بات کہی تھی لیکن ممتا اس میں میرا زیادہ قصور نہیں ہے کیونکہ میں اپنی پریشانی میں اپنے ہوش کھو بیٹھا تھا۔

’’لیکن آدمی اتنے ہوش تو نہیں کھو دیتا ہے کہ اتنے بڑے فیصلے ایک دم کرے۔ میں اس دوران کسی کے ساتھ شادی کی ہاں کر دیتی تو......؟

تو......تو میں تو مر ہی جاتا۔‘‘ وہ فوراً بولا۔ ’’سچ مانو ممتا تم کو خود سے الگ کرنے کا فیصلہ کرنے سے ہی میں مر گیا تھا۔ تم کو وہ فیصلہ سُناتے ہوئے بھی مر گیا تھا لیکن اب مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے کسی نے میرے سینے میں نئی سانس بھر کے مجھے پھر سے زندہ کر دیا ہے۔ زندہ بھی ایسا کہ روزگار کی نہ صرف اُمید ہی بلکہ ایک پورا یقین بھی میرے سینے میں بسا دیا ہے۔

ممتا نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا جیسے اُسے یقین ہی نہ آیا ہو۔ وشال جلدی سے بولا۔ ’’ہاں تم ممتا کو تو میں اپنا دل جگر مانتا ہوں اس لیے تم کو حاصل کرنے کے لیے میں بڑی سے بڑی قیمت دے سکتا ہوں۔‘ ابھی کچھ دیر پہلے مجھے نوکری کا یقین دلایا گیا ہے۔ مجھے یہ نوکری حاصل کرنے کے لیے بے شک بڑی سے بڑی قیمت دینا ہوگا لیکن وہ قیمت دینے

کے لیے میں خوشی سے تیار ہوں۔"

"بہت اچھی بات ہے۔" وہ خوشی سے بولی۔ اور اگر وہ قیمت دیتے ہوئے تمہیں مجھ سے کوئی مدد چاہیے ہوگی تو مجھے ضرور بتا دینا۔"

"میں وہ انتظام کر چکا ہوں ممتا۔ میں اپنے دل سے، اپنے ذہن سے، اپنی آتما سے وہ قیمت دینے کو تیار بھی ہو۔ تم کو پانے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑے تو کیا غم ہے؟"۔

ممتا کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی لگا کہ وہ بھی ہنسنا شروع کرے گی اور پھر ہنستی رہے گی۔ یہ بھی لگا کہ وہ ابھی رونا شروع کرے گی اور پھر روتی رہی گی؟ لگا وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ کچھ بولنا چاہتی ہے، کچھ ظاہر کرنا چاہتی ہے لگا وہ جانے کیا کر گزرے گی۔ وشال نے آج تک کسی بھی مرد یا عورت کے چہرے پر اتنے بدلتے ہوئے تاثر نہ دیکھے تھے۔ دراصل ممتا کو وشال کی زندگی میں آنے والی ہر چھوٹی بڑی خوشی کا بے صبری سے انتظار تھا۔ خوشی کی شدت مچل کر اُس کے لبوں پر پھیلی اور مچل کر ہی اُس کی آنکھوں سے بہہ نکلی۔ مُسکراہٹ اور آنسوؤں کا ایسا امتزاج، ایسا سنگم وشال نے پہلی بار دیکھا تھا۔ مسکراہٹ کیا ہوتی ہے، آج ہی اُسے پتہ چلا تھا۔ آنسوں کیا ہوتے ہیں یہ بھی آج ہی اُسے پتہ چلا تھا۔ تب اچانک ہی ممتا کی نظر وشال کی گردن کے گھاؤ پر گئی تو تڑپ کر بولی۔

"یہ کیا ہوا ہے؟"۔

"کچھ نہیں۔ ذرا سی چوٹ لگی ہے۔"

"لیکن کیسے؟"۔

"تمہیں کیا بتاؤں ممتا کہ آدمی کو چوٹ کب اور کیسے لگتی ہے؟۔ تم تو تم ہو۔ ہر بات پر اپنی ان خوبصورت آنکھوں سے آنسوں بہانے لگتی ہو۔ اس چوٹ کی کہانی سُن کر بھی بہاؤ گے لیکن ممتا آنسوں بہانے سے تقدیر تو نہ بدلے گی۔

"ہاں۔" وہ اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئی بولی۔ تم ٹھیک کہتے ہو کہ ان سے تقدیر نہ بدلے گی۔ اس سے تقدیر بدلتی ہوتی تو کب کی بدل گئی ہوتی۔"

"ہاں ممتا۔" بہت آنسوں بہائے ہیں تم نے۔ وشال کا بھی من بھر آیا تھا، اور یہ سارے آنسوں تم کو میں نے دیئے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آج تک تمہیں کوئی خوشی

نہ دے سکا ہوں۔''

''ایسا نہ کہو۔'' وہ فوراً بولی۔ ''تم نے مجھے اپنا پیار دیکر مجھے زمانے بھر کی خوشیاں دی ہیں۔ کیا ہوا کہ ابھی تم کماؤ نہ ہو سکے؟۔ کیا ہوا کہ ابھی تم میری مانگ میں سیندور نہ ڈال سکے؟۔ وقت ایک جیسا نہیں رہتا ہے۔ تمہیں ضرور نوکری ملے گی۔ تب تم میری مانگ میں سیندور بھر لینا اور میرا ہاتھ تھام کر مجھے اپنے گھر لے جانا۔ میرے سارے دُکھ درد مِٹ جائیں گے۔ تم بھی جتنی چاہو، مجھے محبت دے دینا، مجھے خوشیاں دے دینا۔''

دور تک وہ سڑک کنارے چلتے ہوئے نکل گئے تھے۔ ایک دوسرے کا ان کو پھر سے ساتھ کیا نصیب ہوا تھا کہ وہ دونوں جیسے پوری کائنات سے مدہوش ہو گئے تھے۔ محبت نے اُن دونوں کو دیوانہ بنایا ہوا تھا، آج ذرا سی خوشی کیا ملی تھی کہ وہ بے حس ہو گئے تھے۔ دونوں میں سے کسی کو کسی چیز کی ہوش نہ تھی۔ تبھی ایک ٹرک بہت تیزی سے وشال کے بالکل قریب سے نکل گیا۔ وشال اچھل کر کنارے ہٹ گیا۔ ممتا کی جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ اُس کی دُنیا تو مٹتے مٹتے بچی تھی۔ وہ ڈرائیور کو گالیاں دیتے رہ گئی۔

''چھوڑو بھی اب۔'' وشال بولا۔ ''وہ تو نکل ہی گیا۔''

''میرے ہاتھ لگتا تو میں اُس کی جان ہی لیتی۔''

''ممتا۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ''غصہ تو تم اُس ڈرائیور پر کر رہی ہو لیکن کل کو اگر مجھے کچھ ہو جائے تو تم کیا کرو گی؟۔''

''ایسی باتیں نہ کرو۔'' وہ فوراً بولی۔ ''میں تو مر ہی جاؤں گی۔''

''نہیں......'' وہ تڑپ اُٹھا۔

''ہاں وشال۔ میری زندگی میں کیا رہے گا کہ میں جی لوں گی۔''

''فرض کرو ممتا کہ ایسے ہی کسی حادثے میں میری ایک ٹانگ کٹ جاتی ہے تو......؟۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو تم......؟۔''

''مان لو ممتا۔ اگر ایسا ہو گیا تو......؟۔''

اُس نے تھوڑی دیر کے لیے رک کر وشال کی طرف دیکھا۔ لگا جیسے وہ شکوہ گلہ کر رہی

ہو۔ پھر بولی۔ ''تم میری محبت کا امتحان لینا شروع کرو گے۔ مجھے اُمید نہ تھی۔

''میں تمہاری محبت کا امتحان لینے کی ہمت کیسے کر سکتا ہوں ممتا؟۔ تم تو محبت کی وہ دیوی ہو جس کی پوجا پوری عمر کر کے بھی میں اپنا فرض نہ چکا پاؤں گا۔ اری تمہاری محبت تو میری زندگی کا آئینہ ہے۔ آئینے میں عکس تو اپنا ہی آتا ہے، پھر امتحان کیسا؟ یہ خیال تو مجھے یوں ہی آیا تھا۔

وہ پھر اُس کے ساتھ چلتی رہی لیکن اب وہ بہت سنجیدہ اور گھمبیر ہو گئی تھی۔ گردن جھکائے وہ جانے کیا سوچ رہی تھی؟ پھر کچھ دیر میں وہ بولی۔ ''تمہارے لیے ہمارے درمیاں کیا رشتے ہیں، یہ مجھے معلوم نہیں لیکن میرے لیے ہم دونوں کے درمیاں جو رشتے ہیں وہ کبھی بھی نہیں ٹوٹ سکتے ہیں۔ تم پر کوئی بلا آ رہی ہو تو میں وہ ہنس کے لوں گی اور لینے کے بعد میں سمجھوں گی کہ مجھے تم سے بہت بڑی سوغات ملی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کل تمہارے ساتھ شادی کرنے کے بعد اگر میرے ساتھ کوئی ایسا حادثہ پیش آیا جس میں، میں اپنے جسم کا کوئی حصہ کھو جاؤں تو کیا اُس وقت تم مجھے چھوڑ دو گے۔؟

''بس ممتا۔ مجھے شرمندہ نہ کرو۔

''نہیں۔ میں تمہیں شرمندہ کرنے کے لیے ایسا نہ کہہ رہی ہوں بلکہ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تم نے آج پہلی بار میری محبت کا مذاق اُڑایا ہے لیکن تم آج یہ میرے سے لکھوا دو کہ ہو سکتا ہے کہ کسی وجہ سے تم میرا ساتھ چھوڑ بھی دو، میں تمہارا ساتھ کبھی نہ چھوڑوں گی۔''

وشال کے دل میں ممتا کے لیے بے پناہ محبت تھی۔ وہ ممتا کو کھونا نہیں چاہتا تھا بلکہ اُس کے ساتھ رہ کر پوری زندگی گزارنا چاہتا تھا اور یہ صرف تب ممکن تھا جب وہ کماؤ ہو جائے۔ اسی لیے اُس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ممتا کو حاصل کرنے کے لیے اپنی ایک ٹانگ کی قربانی ضرور دے گا۔ اُس نے سوچا کہ اپنی ٹانگ کٹوانے کے بعد اُسے جب نوکری ملے گی تب وہ ممتا سے ملے گا۔ ممتا اُسے ضرور اپنائے گی۔ یہ یقین اُس کے دل میں تھا۔ نہ بھی اپنائے گی تب بھی اُسے کم از کم زندگی بھر کے لیے روٹی تو ملتی رہے گی۔ نوکری نہ ملنے کی صورت میں ویسے بھی ممتا سے اُس کا ملن غیر یقینی تھا۔ اس لیے امتحان میں فارم بھرنے کے بعد وہ اپنے شہر جمنا نگر سے چپ چاپ چل دیا تا کہ اُس پر جو بیت جائے گی وہ سب کچھ تنہا سہہ لے اور

ممتا کو اس سب کا علم نہ ہو کیونکہ ممتا کے لیے اس کا درد سہہ لینا اور اُس کا لہو دیکھنا ممکن نہ تھا۔ اُسی شام کو بھرت پور میں نیلما کی گاڑی کے ساتھ اُس کا حادثہ ہوا جو دراصل حادثہ نہ تھا بلکہ جان بوجھ کر اُٹھایا ہوا اُس کا ایک قدم تھا۔

وشال نے اپنی کہانی ختم کر کے نیلما کی طرف جس کی آنکھوں میں آنسوں بھر آئے تھے۔ اُس کے چہرے کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ابھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے گی اور روتے ہوئے سب کے سامنے دہائی دینا شروع کرے گی۔

''تم رو رہی ہو؟۔'' وشال نے پوچھا۔

''تمہاری کہانی سُن کر تو پتھر کا کلیجہ بھی پھٹ جائے گا پھر میں تو تم سے......؟ وہ کہتے کہتے رک گئی کیونکہ وہ اب کسی بھی صورت میں وشال پر اپنا پیار ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی کیونکہ اُس کی کہانی جان لینے کے بعد وہ وشال کو ممتا کی امانت ماننے لگی تھی لیکن دل ہی دل میں اُس نے سوچا کہ اگر وشال کے لاپتہ ہونے کے بعد اُس کی غیر حاضری میں ممتا نے اپنا گھر بسایا ہو گا یا اگر وشال کا حال دیکھ کر ممتا اس کے ساتھ شادی نہ کرے گی تو وہ وشال کے سامنے اپنی جھولی پھیلا کر اُس سے اُس کی محبت کی بھیک مانگے گی اور اگر اُسے وہ بھیک ملتی ہے تو وہ خود کو دنیا کی خوش نصیب ترین سہاگن مانے گی۔

''یہ صرف میری کہانی نہیں ہے نیلما بلکہ میرے جیسے ہزاروں لوگوں کی کہانی ہے۔ ایک صرف میں ہی نہیں ہوں دُنیا میں جو رشوت نہ دے پایا ہو اور بھی لاکھوں لوگ ایسے ہیں۔ اُن میں شاید کچھ لُٹیرے بنے ہوں گے، کچھ چور اُچکے، کچھ دہشت پسند، کچھ تو گھٹ گھٹ کے مر گئے ہوں گے اور کچھ میری طرح......؟ وہ اپنی ٹانگ کے کٹے ہوئے حصے کو اپنی خالی خالی آنکھوں سے تلاشتے ہوئے بولا۔ یہ کم بخت نوکری حاصل کرنے کے لیے لوگ جانے کیا کیا کرتے رہے ہیں؟ آخر سب کو خوشیوں کی۔ روٹی کی، عزت کی اور کسی نہ کسی ممتا کی ضرورت اور تلاش ہے۔''

''تم دُرست کہہ رہے ہو۔''

''میں سوچتا ہوں کہ کہاں ہیں ہمارے بنیادی حقوق۔ کیا یہ صرف بااثر لوگوں کے لیے ہیں؟۔''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ وہ فوراً بولی۔ '' قانون سب کے لیے ہیں، حقوق بھی سب کے لیے ہیں لیکن کچھ بااثر لوگوں نے قانون کو اپنی مُٹھی میں کر دیا ہے۔''

''اور اس کی سزا عام لوگوں کو مل رہی ہے۔''

''تم درست کہہ رہے ہو۔ وہ اپنی کار موڑتے ہوئے بولی۔ '' بالکل درست۔''

''لیکن تم نے اپنی کار کیوں موڑ دی۔''

''گھر چلتے ہیں۔''

''ابھی سے......؟''

''ہاں'' بہت دیر ہوئی ہے۔ اب میں اور دیر نہیں کرنا چاہتی ہوں۔ ابھی میرے دل میں تمہاری کہانی سے جاگا ہوا درد بہت جوان ہے۔ ابھی اُس درد سے میری آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کی نمی برقرار ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ درد کچھ کم پڑ جائے اور نمی سوکھنے لگے میں تمہاری کہانی لکھنا شروع کرنا چاہتی ہوں تاکہ اُسے ایک ناول کا روپ دیکھ کر جلد سے جلد بازار میں لے آؤں اور سب کو بتادوں کہ ہمارے سماج نے کیا کیا گھناونے کھیل کھیلے ہیں؟''

''میری کہانی سے کوئی انقلاب آئے گا مجھے تو ایسا نہیں لگتا ہے کیونکہ پہلے ہی میرے جیسے کئی لوگوں کی کہانیاں تمہارے جیسے کئی لوگوں کے ہاتھوں دُنیا کے سامنے آئی ہوں گی لیکن میں نے کسی انقلاب کو نہ آتے دیکھا ہے۔ انقلاب تو دور کی بات ہے میں نے کسی کو ایسے رواجوں کے خلاف ہلکی سی آواز بھی نہ اُٹھاتے سُنا ہے۔

تمہاری کہانی میں درد بھی ہے، سچائی بھی ہے وشال اور میرے دل کو یقین ہے کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔

''بہر حال میرا پورا تعاون تمہارے ساتھ ہے۔''

''تمہارے تعاون کے بغیر میں کچھ نہ کر پاؤں گی۔''

''میں ہر تعاون دینے کو تیار ہوں لیکن میں تم سے یہ امید رکھوں گا کہ تم میری زندگی کی ہر سچائی کے ساتھ پورا انصاف کروگی۔ چاہے وہ سچائی بہت کڑوی بھی کیوں نہ ہو۔''

''تم اطمینان رکھو۔''

گھر پہنچتے ہی سب سے پہلے نیلما نے اپنے بھائی ڈاکٹر راہول سے وشال کو چھٹی دلوا دی اور پھر وشال کو اپنے ساتھ بٹھا کر اُس نے اُس کی کہانی لکھنا شروع کی۔ وہ جلد از جلد سب کچھ کر دکھانا چاہتی تھی اور اس میں وشال نے بھی اُس کی پوری مدد کی۔ نیلما بھی اُس کی جانکاری دیکھ کر اُس سے بہت متاثر ہوئی۔ نیلما کے لیے لکھنا شوق تھا، پیشہ تھا، پیار تھا اور مشغلہ تھا گویا لکھنا اُس کی زندگی تھی۔ وشال کے لیے یہ ایک فرض تھا کہ وہ نیلما کی مدد کرے۔ دونوں کی انتھک کوششوں کے بعد پورے دو مہینوں میں وہ ناول پورا ہو گیا۔ نیلما تھکی سی ایک انگڑائی لے کر بولی۔

’’تھک گئے ہو کیا؟‘‘

’’تھکی ہوئی تو تم لگ رہی ہو۔‘‘

’’نہیں لیکن دل ذرا اُداس ہے۔‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’تمہاری کہانی کی وجہ سے۔ تمہاری یہ کہانی ہر دل پر ہتھوڑے مارے گی۔

’’عام لوگوں کے دل پتھر کے ہوتے ہیں، ہتھوڑے اُن پر اثر نہیں کرتے ہیں۔‘‘

’’ہتھوڑے بھی تو لوہے کے ہوتے ہیں، پتھر ٹوٹ ہی جاتے ہیں۔ ان کی ضربوں سے۔‘‘

’’مجھے شک ہی ہے۔‘‘

’’مجھے یقین ہے۔‘‘

’’تمہارا یقین بھی دیکھ لوں گا۔

نیلما نے وہ ناول اپنے پبلشر کو دکھایا تو اگلے ہی دن پبلشر نے اُسے فون کر کے بُلایا۔ بولا۔’’ آپ نے تو کمال کر دیا نیلما جی۔ آپ کا یہ ناول بہت نام کرے گا آپ کا۔‘‘

’’تھینک یو لیکن میں چاہتی ہوں کہ یہ ناول بہت جلد چھپ جائے۔‘‘

’’ایسے ناول کو چھاپنے میں، میں بھی دیر نہ کرنا چاہوں گا لیکن......؟‘‘

’’لیکن کیا......؟‘‘

’’لیکن مجھے ڈر ہے اس ناول کو پڑھنے کے بعد لوگ کوئی ہنگامہ نہ کریں۔‘‘

’’میں بھی یہی چاہتی ہوں کیونکہ اب ہنگامے کرنے کی بہت ضرورت ہے۔‘‘

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"

کچھ ہی دنوں میں وہ ناول چھپ کر بازار میں چلا آیا تو نیلما نے اُس کی ایک جلد بڑے ہی ناز سے وشال کو تحفے میں دی۔ وشال اُس ناول کو ہاتھ میں لے کر اُس کو دیکھتا رہا۔ وہ یہ نہ سمجھ پا رہا تھا کہ اُسے مسکرانا چاہیے یا رونا چاہیے!!۔

اُس ناول کا عنوان نیلما نے بڑے سوچ وچار کے بعد رکھا تھا۔

"میری روٹی کہاں ہے؟"۔



"تانا شاہی...... نہیں چلی گی۔"

"نہیں چلے گی...... نہیں چلے گی۔"

"رشوت خور افسر...... ہائے ہائے۔"

"ظلم ہے سرکار کے ایوان میں...... نوجوان آ گئے میدان میں۔"

نوجوان واقعی میدانِ عمل میں آ گئے تھے اور جب کسی قوم، کسی ملک کے نوجوان میدانِ عمل میں آ جاتے ہیں تب قدرت کے نظام کو چھوڑ کر ہر نظام رُک جاتا ہے اور حکومتوں کی بنیادیں ہل کے رہ جاتی ہیں۔

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اقبالؒ کے اس روح پھونک شعر نے قوم کے نوجوانوں کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا اور بھرت پور میں نوجوان میدانِ عمل میں ایسے اُترے تھے کہ حکومت کے لیے اس صورتِ حال کو سنبھالنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوا جا رہا تھا۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بلا لحاظ مذہب و ملت اور دھرم جاتی کے آواز بلند کر چکے تھے۔ یوں تو شہر کی سڑکوں پر صرف نوجوان ہی آ گئے تھے لیکن اُن کے ساتھ سماج کے ایک خاص طبقے کے علاوہ ہر طبقے کے لوگوں کی آواز تھی کیونکہ تانا شاہوں کی تانا شاہی اور رشوت خوروں کی رشوت خوری کا شکار تقریباً سماج کا ہر آدمی تھا اور بس دو دنوں میں یہ نعرے بازی صرف نعرے بازی نہ رہی بلکہ ایک ہنگامہ آرائی بن گئی۔ سرکاری گاڑیاں اور سرکاری عمارتیں نذرِ آتش ہوتی گئیں۔ سرکار اور پولیس بے بس ہو کر رہ

گئی کیونکہ اس ہنگامہ آرائی میں ایک آدمی نہیں، ایک طبقہ نہیں، بلکہ پورا سماج شامل تھا۔ بھلے ہی چند تاناشاہ یارشوت خور اس میں شامل نہ ہوں۔ ہنگامہ آرائی اتنی بڑھی کہ بڑے بڑے افسر، ایم۔ ایل۔ اے اور منسٹر پولیس کے بھاری پہرے کے بغیر گھر سے باہر آنے کی ہمت چھوڑ بیٹھے۔ چونکہ یہ آواز ہر دل اور ہر گھر سے اُٹھی تھی اس لیے سرکار عوام پر بہت زیادہ طاقت کا استعمال کرنے کی ہمت بھی نہ کر رہی تھی۔

سرکار چاہتی تھی کہ اس آگ کو ہوا نہ لگنے دی جائے لیکن اس آگ کو ہوا لگ ہی چکی تھی۔ پریس (Press) نے تیل چھڑک کر آگ اور زیادہ بھڑکائی اور پریس کے ذریعے یہ آگ دوسرے شہروں میں بھی پہنچی اور اُن شہروں میں بھی ہنگامے شروع ہو گئے لیکن سب سے زیادہ ہنگامے بھرت پور شہر میں ہی تھے جہاں سرکاری املاک کا بہت زیادہ نقصان ہو رہا تھا اس لیے پولیس نے پہلے لاٹھی چارج کیا کئی لوگ زخمی ہو گئے لیکن حالات کے سُدھرنے کا کوئی امکان ہی نظر نہ آیا۔ کئی جگہ آنسوں گیس بھی نوجوانوں کے حوصلے توڑنے میں ناکام رہی تو گولی چلی۔ گولی چلنے سے دو نوجوانوں کی موت ہو گئی تو پھر حالات پوری طرح سرکار کے قابو سے باہر ہو گئے اور اتنی زیادہ ہجوم سڑکوں پر نکل آئی کہ سرکار کو پورے شہر میں کرفیو نافذ کرنا پڑا۔ صرف بھرت پور میں ہی نہیں بلکہ آس پاس کے شہروں میں بھی کرفیو نافذ کرنا پڑا کیونکہ دوسرے شہروں میں بھی حالات قابو سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔ ساتھ ہی اعلیٰ سرکاری اور پولیس افسروں کی ایک ضروری میٹنگ بلائی گئی جس میں اتفاق رائے سے کماری نیلما کے ناول "میری روٹی کہاں ہے؟" پر پابندی عائد کی گئی اور کسی بھی جگہ اُس ناول کے خرید و فروخت کے علاوہ اُس کے مطالعے پر بھی پابندی لگا دی گئی۔

پہلے تو نوجوان ہی میدان میں آ گئے تھے اب نیلما کے نئے ناول پر پابندی لگائے جانے کے بعد شہر کا دانشور طبقہ بھی کھل کر میدان میں آ گیا۔ سارے دانشوروں نے اور سارے اخباروں نے اس پابندی کے خلاف آواز اُٹھائی، اور دور دور تک دھنگے فساد ہوئے۔ نیلما کے نام کے چرچے بھی دور دور تک ہوئے اور جانے کتنے اخباروں اور جریدوں کے نمائندے اُس کے انٹرویو کے لیے آئے۔ وہ دشال سے بولی۔

"میں نہ کہتی تھی انقلاب آئے گا۔"

''ہاں''، تمہاری بات دُرست نکلی۔''

اب دیکھو کہ آگے کیا ہوتا ہے؟''۔

''دو چار لوگ پولیس کی گولی سے اور مر جائیں گے۔''

''نہیں''۔ اب پولیس گولی چلانے کی ہمت نہ کرے گی۔''

''لیکن قانون نافذ کرنے کے لیے ایسا کرنا ہی پڑے گا۔''

نیلما نے کچھ کہنا ہی چاہا تھا کہ باہر سے کچھ آوازیں آئیں تو اُس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ کچھ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اُن سے ملنے آئے تھے۔ نیلما اُن کو عزت اور پیار سے اندر لے آئی۔ بولی۔

''آپ کرفیو کے دوران کیسے چلے آئے؟''

''ہم گلی کوچوں سے چھپتے چھپاتے آئے ہیں۔'' ایک نوجوان بولا۔ ''ہم آپ سے ملنا چاہتے تھے۔''

''ملنے میں کوئی پابندی نہیں ہے لیکن کرفیو میں ڈھیل ہوتی تب آجاتے۔''

''ہم سے انتظار نہ ہو سکا۔'' دوسرا نوجوان بولا۔ ''جب سے آپ کا نیا ناول پڑھا ہے تب سے آپ سے ملنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔ بس آپ کا پتہ ملتے ہی چلے آئے۔''

''ہاں'' ایک لڑکی بولی۔ شاید آپ نہیں جانتی ہیں کہ شہر کا ہر نوجوان آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

''کیوں......؟''

''کیونکہ آپ نے ہماری مشکلوں اور مسئلوں کو ابھار کر ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔''

''کوئی احسان نہیں کیا میں نے۔'' نیلما فوراً بولی۔ میں بھی نوجوان ہی ہوں اور آج کے نوجوانوں کی مُشکلیں مجھ سے زیادہ اور کون سمجھے گا؟۔ ویسے بھی میں نے وہی لکھا ہے جو آج کل ہو رہا ہے۔ بس میں نے جو دیکھا وہ لکھ دیا تا کہ سب کو نوجوانوں کی مشکلوں اور سماج کی برائیوں کا پتہ چلے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ آپ کی یہ کہانی سچی ہے؟''

''ہاں''۔

''یعنی آپ کے ناول کا ہیرو دیپک ایک فرضی کردار نہیں ہے؟''۔

''بالکل صحیح سوچا آپ نے۔''

انہوں نے بڑی حیرت سے نیلما کی طرف دیکھا۔ ایک نوجوان نے پوچھا۔ آپ کے ناول کے سارے واقعات بھی سچے ہیں اور آپ نے آپ کے ناول کے ہیرو کو بھی دیکھا ہے؟۔

''ہاں'' میں نے اُسے دیکھا ہے، اچھی طرح جانا ہے، اُس کی زندگی کی پوری کہانی اچھی طرح جان لینے کے بعد ہی میں نے یہ ناول لکھا ہے۔ یہ کہانی سچی ہے۔ اس کا ہیرو اصلی ہے، بس نام ہی فرضی ہے۔ میں نے آپ لوگوں کو فرضی ناموں کے ساتھ ایک سچی کہانی دی ہے۔''

''یقین نہیں آتا ہے۔''

''آپ کو میری بات پر یقین نہیں آرہا ہے تو آپ انقلاب میں شامل کیوں ہوئے ہیں؟۔'' نیلما نے پوچھا۔ سچ بتایئے، کیا وہ ناول پڑھنے کے بعد آپ کی آنکھوں سے آنسوں نہیں ہے۔ ہیں؟ کیا آپ کو اُس کہانی کی مرکزی کردار دیپک پر ترس نہیں آیا ہے؟ کیا آپ نے محسوس نہیں کیا ہے کہ وہ کہانی صرف دیپک کی نہیں بلکہ آپ کی بھی ہے؟ اس کے باوجود آپ کو یقین نہ آیا ہوتو......؟ اُس نے پاس بیٹھے وشال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ان سے ملو۔ یہ مسٹر وشال ہیں جن کی زندگی کی کہانی پر میں نے وہ ناول لکھا ہے۔''

وہ لوگ وشال سے بھی ملے اور بہت دیر تک اُس کے ساتھ بیٹھے رہے اور جب وہ گئے تو اُس کے بعد نیلما کے گھر میں نیلما اور وشال سے ملنے کے لیے اور زیادہ لوگ آنے لگے۔ کرفیو کے ڈھیل کے دوران تو ملنے والوں کا تانتا ہی بندھ گیا اور پھر وہ وقت بھی آیا جب نوجوان وشال کو لے کر بازار میں چلے آئے۔ وشال کی سچائی اور موجودگی کی خبر پورے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ سڑکوں پر وشال اور نیلما کو دیکھنے کے لیے ان گنت لوگ چلے آئے۔ نعرے گونج اُٹھے۔ ہنگامہ آرائی اور تیز ہوگئی۔ سرکار چوکنی ہوگئی لیکن اس بار لوگوں کا ارادہ کچھ اور بھی تھا۔ وہ اُن دونوں کو ایک کھلی جیپ میں بٹھا کر جمنانگر لے جانے لگے۔ جمنانگر شہر، جس کی فضاؤں میں ہی وشال پل کر جوان ہوگیا تھا اور جس کی فضاؤں میں ہی وشال دُکھ سہن کر کے ٹوٹ گیا تھا۔ ہر بستی میں لوگ نیلما اور وشال کو دیکھنے کے لیے سڑکوں پر نکل آئے اور ہر بستی سے نکلتے نکلتے وہ جلوس اور لمبا ہوتا گیا۔

جلوس کے جمنانگر مُڑتے ہی یہ خبر جمنانگر پہنچی تو انجلی ماتھر نے یہ خبر ممتا کو فون پر دی۔

یہ جان کر کہ نیلما کے ناول "**میری روٹی کہاں ہے ؟**" کا ہیرو اصل میں وشال ہی ہے اور دیپک پر جو گزری ہے وہ اصل میں وشال پر گزری ہے ممتا مرتے مرتے بچی۔

"ہمت سے کام لو ممتا۔ انجلی بولی۔ جو ہونا تھا وہ ہو ہی گیا ہے۔"

"ہاں"۔

"وہ لوگ جمنا نگر کی طرف آرہے تھے اور شاید کچھ دیر میں وہ گرفتار بھی ہو جائیں۔

"گرفتار......؟"۔

"ہاں" میں نے ڈیڈی سے بات کی تھی لیکن وہ کہتے ہیں کہ جمنا نگر میں اُن کے آنے سے حالات اور بھی خراب ہو سکتے ہیں اس لیے احتیاط کے طور پر اُن کو گرفتار کرنا ضروری ہے۔" بہر حال تم فکر نہ کرو۔ وہ جلد ہی چھوٹ بھی جائیں گے۔ تم وشال سے ملنا چاہتی ہو تو بحرت پور کی طرف جانے والی سڑک پر نکلو۔ وہ وہاں ہی ملے گا۔

کسی نے کسی طرح ممتا نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کسی نہ کسی طرح اُس نے خود کو روی کے گھر تک پہنچا دیا جہاں اُس نے روی کو پوری بات سُنا دی۔"

"اونو......" روی تڑپ اُٹھا۔ کیا اسی لیے وہ ہم سب کو کچھ بتائے بغیر ہی یہاں سے نکل گیا تا کہ اکیلے ہی سارے دُکھ اور درد سہے۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔"

"نہیں۔" ممتا فوراً بولی۔ "رونا نہیں۔"

"میں حیران ہوں کہ تم کیوں نہیں رو رہی ہو؟"۔

"میں نہ روؤں گی کیونکہ اُسے...... اُسے آنسوؤں سے نفرت ہے اور آج تو وہ ہیرو بن گیا ہے ہیرو۔"

"لیکن ممتا ہیرو بنتے بنتے وہ اپاہج ہو گیا ہے۔"

"تو کیا ہوا؟"۔ "وہ فوراً بولی۔ دنیا میں لاکھوں اپاہج ہیں جو خوشی سے جی لیتے ہیں، کماتے ہیں، کھا لیتے ہیں۔

"ہاں مگر......؟"۔

"تم اپنے دل میں کسی غلط فہمی کو جگہ نہ دو روی۔"

"لیکن تمہارے ماں باپ؟"

"میرے کہنے سے انہوں نے وشال کے لیے بہت انتظار کیا ہے جب وہ یہاں سے چلا تھا تو نوین کا رشتہ پھر آیا تھا۔ میرے ماں باپ نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی گپتا جی کے آدمی کو نا کہی تھی کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وشال کے بغیر میری آنکھوں میں کوئی اور نہیں اُتر سکتا ہے۔"

"لیکن آج حالات بدل گئے ہیں ممتا۔ آج وہ اپاہج ہو گیا ہے۔"

"اپاہج ہونا کوئی پاپ نہیں ہے اور پھر اپاہجوں کا ساتھ بھی کوئی نہیں چھوڑتا ہے۔ تم مجھے اُس کے پاس لے چلو روی۔ میں اُس کا شاندار سواگت کروں گی۔"

روی بڑی عقیدت سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ اب میں نے جانا ممتا کہ وہ تمہاری پوجا کیوں کرتا تھا؟ تم تو دیوی ہو دیوی اور تمہاری پوجا کرنے کو میرا دل بھی مچل رہا ہے۔ چند لمحوں کے لیے تو میرے دل میں خیال آیا تھا کہ اب وہ تم سے ملنے بھی آئے گا تو تم اُسے نہ ملو گی لیکن تمہیں دیکھ کر تو مجھے لگتا ہے کہ وہ خیال میرے دل میں جو آیا تو میں پاپی ہو گیا۔ چلو میں تمہیں اُس کے پاس لے چلتا ہوں۔"

روی اُسے موٹر سائیکل پر بٹھا کر وشال کے سواگت کے لیے لے گیا۔ وہ خود بھی وشال سے جلد از جلد ملنا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں ایک ساتھ اپنا بچپن گزار چکے تھے۔ اور وہ ہمیشہ ہی وشال کی زندگی سے متاثر ہوتا رہا تھا۔ جمنا نگر سے صرف چند ایک کلومیٹر باہر انہوں نے نوجوانوں کے ایک بڑے ہجوم کو ایک سرکاری عمارت پر حملہ کرتے ہوئے دیکھا۔ روی نے فوراً ہی موٹر سائیکل روک کر کچھ نوجوانوں سے اس حملے کی وجہ پوچھی تو اُسے پتہ چلا کہ بھرت پور سے جمنا نگر کی طرف آتے ہوئے پولیس وشال اور نیلما دونوں کو گرفتار کر کے لے گئی ہے اس لیے سارے نوجوان اُس سرکاری عمارت کو گرانے کا عزم کر چکے ہیں۔

تم لوگ اس عمارت کو کیوں گرا رہے ہو؟' ممتا چیخ پڑی۔ سرکار کا نقصان ہمارا اپنا نقصان ہے اس لیے ان سرکاری عمارتوں کو گرانے سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔"

"ہم ان سرکاری عمارتوں کو نہ گرائیں گے تو ہماری آواز کون سُنے گا، ایک نوجوان نے پوچھا۔"

"تم لوگ ایک ہو گئے ہو یہ دیکھ کر سب کو خوشی ہوئی ہے اور جب لوگ ایک ہو جاتے

ہیں تو اُن کی آواز دور دور تک جاتی ہے۔ یہ سرکاری عمارتیں ہماری اپنی ہیں۔ ان کو گرانے سے ہمارا اپنا نقصان ہوگا۔ گرانا ہی ہے تو اُن کو گرا دو جو ان اونچی عمارتوں میں بیٹھ کر وشال جیسے اپاہج پیدا کرتے ہیں۔

سارے نوجوان ممتا اور روی کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ روی بولا۔ ''ہاں، یہ عمارت تو ہماری ہے۔ آج ہم سب نہ صرف اپنا حق اور اپنی اپنی روٹی حاصل کرنے کے لیے نکلے ہیں بلکہ پورے دیش اور پورے سماج کو سُدھارنے کے لیے نکلے ہیں۔ ہمارا حق اور ہماری روٹی یہ عمارتیں نہیں چھین لیتی ہیں بلکہ ان عمارتوں کے باشندے ہم سے یہ سب چھین لیتے ہیں اس لیے ان عالیشان اور اونچی اونچی عمارتوں میں اُن کی کھوج کرو۔ عمارتیں تو بے گناہ ہیں۔ ان میں بیٹھنے والے تانا شاہوں کو گرا دو۔''

''ہاں۔'' ہم آج اُنہیں ختم کریں گے۔'' ایک نوجوان جوش کھا کر بولا۔ آج ہم سب جمع ہو گئے ہیں۔ آج پہلی بار ہم سب اپنی اپنی روٹی کی تلاش میں مل کر نکلے ہیں تو ہم اُن کو معاف نہ کریں گے جو ہمارے ساتھ کھیل رہے ہیں۔''

''ہاں'' ۔ دوسرا نوجوان بھی جوش میں بولا۔ ''یہ ہماری مجبوری ہے کیونکہ ہم ایسا نہ کریں گے تو یہ رواج کبھی ختم نہ ہوں گے۔ آج ہم سب نوجوان میدان میں آگئے ہیں تو کیا ہمالیہ اور کیا سمندر؟۔ ہم ہر دیوار توڑ دیں گے۔

''ہاں''۔ ایک لڑکی بولی۔ ہمیں صرف اُن دو آدمیوں کے اصلی نام بتا دو جنھوں نے ہمارے رہبر، ہمارے رہنما وشال کا یہ حال بنا دیا ہے تاکہ اُن کا وجود مٹا کر ہم آنے والی نسلوں کو اُن سے چھٹکارا دلا سکیں۔''

ممتا نے روی کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کہ کیا اُسے اتنے سارے نوجوانوں کو گپتا جی اور موہن بابو کے نام بتا دینے چاہئے۔ روی اُس کی مشکل جان گیا تھا۔ نوجوانوں کو یہ سب بتانا خطرے سے خالی نہ تھا اور پھر یہ سب بتانے کا انجام بھی بُرا ہو سکتا تھا۔ وہ خود بھی سرکاری ملازم تھا اور ممتا بھی سرکاری ملازم تھی۔ گپتا جی اور موہن بابو کا نام بتا کر وہ قانون کے ہاتھوں کسی مشکل میں نہ پڑنا چاہتا تھا۔ بولا۔

''وشال کی زندگی کی کتاب آپ لوگوں کے سامنے ہے۔ ذرا سا دماغ لگا لو۔ سب

کچھ جان جاؤ گے کیونکہ ہم جیسے عام اور غریب لوگوں کو لوٹنے والے بڑے لوگ ہی ہوتے ہیں۔ نیلما جی نے تو اپنے ناول ''میری روٹی کہاں ہے؟ میں آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔'' روی نے کہا تو پورے ہجوم پر خاموشی سی چھا گئی۔ پھر اچانک ہی ایک نوجوان بولا۔

''صرف اتنا بتا دو کہ اگر نیلما جی کے ناول کا کردار دیپک اصل میں وشال ہے تو کیا اُس ناول کا کردار سیٹھ وان اصل میں شودت ہے؟۔''

''ہاں'' مگر تم شودت کے بارے میں کیا جانتے ہو؟۔ روی نے پوچھا۔''

یہ کہ پچھلے چناؤ میں موہن بابو کا ساتھ دینے کی وجہ سے گپتا جی اور اُس کے بیٹے نوین سے اُسے ختم کر دیا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ وشال کو برباد کرنے والے وہی تین لوگ ہیں۔ موہن بابو، گپتا جی اور نوین۔ چلو میرے ساتھ۔ اُس کے کہنے کی دیر تھی کہ پورا ہجوم اُس کے پیچھے ہو کر جمنا نگر کی طرف چل پڑا جیسے سچائی کی حفاظت کے لیے بانر سینا نے لنکا پر حملہ کیا ہو۔ لگا آج کی یہ بانر سینا ایک نہیں کئی راون مار گرا کر لوٹ آئے گی۔ ایک بار پھر سچ کی جیت لکھوا کر لوٹے گی۔ لگا گنہگاروں کا سرونا وش اب زیادہ دور نہیں ہے۔ ممتا سب کو دوڑتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کے ساتھ روی بھی کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا۔ جب بھرے ہوئے نوجوانوں کا وہ منہ زور ہجوم بہت دور نکل گیا تو ممتا اپنے آنسوں پونچھ کر روی سے بولی۔

''آج ایک انقلاب آیا ہے نا؟۔''

''ہاں''۔

''آج کا انقلاب ایک انوکھا انقلاب ہے۔ اس سے پہلے انقلاب کبھی نہ آیا ہوگا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو۔''۔

''اس انقلاب کے لیے وشال نے بہت کچھ سہن کیا ہوگا لیکن نیلما نے بھی بہت محنت کی ہے۔ اُس کے ناول کو پڑھنے کے دوران میرے خیال سے ہر آدمی رویا ہوگا۔ وہ اس انقلاب کو خود بھی دیکھ رہی ہوگی۔ سوچ رہی ہوگی کہ اُس کی محنت

بے کار نہ گئی۔ وہ نیلما نہ رہی شکسپیئر اور ٹالسٹائی ہو گئی۔''

''اور وشال......؟''۔

''وہ......؟'' اُس کی آنکھوں میں آنسوں بھر آئے۔ بولی۔ ''وہ تو باورا ہے اور میں خود کو اُس کی بربادی کا ذمہ دار ماننے لگی ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''میں......'' وہ رو پڑی۔ میں بُزدل ہوں۔ میں اپنے خاندان کا یہ رواج نہ توڑ سکی کہ لڑکیوں کی شادی سرکاری ملازم ہی سے ہونی چاہئے۔ میں...... میں اپنے ماں باپ کو یہ بھی نہ کہہ سکی کہ جیسے مرد عورت کی ضرورتیں پوری کرتا ہے، ویسے ہی عورت بھی مرد کی ضرورتیں پوری کر سکتی ہے۔ میں تو کماؤ تھی ہی۔ اُس کے ساتھ شادی کر کے گھر گرہستی چلا سکتی تھی۔ میں ایک لڑکی ہوں نا؟۔ بول نہ سکی کہ یا تو دماغوں سے یہ سوچ نکالی جائے کہ شادی کے بعد عورت کی ذمہ داری اُس کے مرد کی ہوتی ہے یا پھر عورتوں کو یہ سب کام نہ دیئے جائیں۔ آج عورتیں ہر دفتر میں کام کرتی ہیں تو ظاہر ہیں کہ مردوں کو کام ملنے کے موقعے کم ہو گئے ہیں اس لیے یہ سوچ بدلنا ہی ہوگی کہ مرد کو ہی عورت کی ضرورتیں پوری کرنا ہوں گی۔''

''اس سے اچھا یہ ہے ممتا کہ شادی کے بعد ہر پڑھی لکھی جوڑی میں سے صرف ایک کو سرکاری نوکری دی جائے۔ اُس سے بے روزگاری بھی دور ہوگی اور وشال جیسے حالات بھی نوجوانوں کے سامنے پیدا نہ ہوں گے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو اور میں نے سنا ہے کہ کچھ ملکوں میں ایسا قانون ہے۔''

''یقیناً وہاں کے لوگ خوش ہوں گے اور یہاں کے لوگ......؟ وہ اُداس ہو کے بولا۔ ایسے قانون کو ترستے ہیں۔''

''وقت ایسا بھی آئے گا۔''

''شاید۔''

شاید نہیں بلکہ ضرور آئے گا۔ آج کا انقلاب کچھ نہ کچھ رنگ ضرور لائے گا۔ آج تو سارے نوجوان ایک ہو گئے ہیں اور اُن کے پیچھے سارے لوگ ہیں۔ آج

مجھے تاریخ کے وہ دن یاد آرہے ہیں جب آزادی کے لیے لڑنے والے لوگ کیا کیا ستم نہ سہتے ہوں گے۔ تب بھی پورے بھارت کے لوگ ایسے ہی ایک ساتھ مل کر آزادی کی جنگ لڑے ہوں گے۔''

''ہاں ممتا۔'' اسی لیے تو ہمیں آزادی ملی۔ جب سارے لوگ ایک ساتھ ہو جاتے ہیں تب وہ ضرور کوئی نہ کوئی تبدیلی لے آتے ہیں۔ لیکن آزادی کے لیے لڑنے والے لوگوں کا نشانہ تو انگریز تھے جن کو وہ بھگا گئے اور میں سوچ رہا ہوں کہ ہمارا نشانہ کون ہے؟ ہم کس کو بھگا رہے ہیں؟۔''

ہمارے یہ اپنے لیڈر تو انگریزوں سے بھی بدتر ہیں اور روی ہماری یہ جنگ بھی ایک طرح سے آزادی کی ہی جنگ ہے کیونکہ اگر ہم یہ جنگ نہ جیت پائے تو ہم عمر بھر کے لیے غلام بن جائیں گے اور وہ غلامی تو انگریزوں کی غلامی سے بھی بدتر ہوگی کیونکہ وہ غلامی ہمارے نوجوان لوگوں کو تباہ کرے گی اور جس دیش کے نوجوان غلام ہو جاتے ہیں وہ دیش تو تباہ ہی ہو جاتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو ممتا۔ یہ جنگ بہت ضروری بھی ہے اور اس جنگ میں ہمارے نوجوانوں کی جیت بھی ضروری ہے۔ لیکن ممتا اُن کا مقابلہ اُس طاقت سے ہے جس کی جڑیں بہت مضبوط ہیں۔ اُن رشوت خوروں نے جگہ جگہ پولیس بچھائی ہوگی۔ اُن نوجوانوں کی زندگیاں خطرے میں پڑ سکتی ہیں۔''

''ہاں ہمیں چل کر اُن کی مدد کرنا چاہیے۔''

''چلو چلتے ہیں۔''

جب وہ جمنا نگر پہنچے تو نوجوانوں اور پولیس میں آمنے سامنے جھڑپ ہو رہی تھی۔ اس جھڑپ میں صرف بھرت پور سے آئے ہوئے نوجوان ہی نہیں تھے بلکہ جمنا نگر کے نوجوان بھی اُن کے ساتھ مل گئے تھے۔ جانے کتنے لوگ زخمی ہو گئے تھے، جانے کتنے مر گئے تھے اور جانے کتنے گرفتار ہو گئے تھے لیکن نوجوان پھر سے بھی ڈٹے ہوئے تھے۔

''دیکھو۔'' روی ممتا سے بولا۔ ''ہماری آزادی کی نئی جنگ دیکھو۔''

''ہاں۔ دیکھ رہی ہوں میں۔ انگریزوں نے بھی ہمارے لوگوں پر اتنی سختی نہ کی ہوگی۔''

''لیکن دیکھو ہم کن سے لڑ رہے ہیں؟۔''

''اس دیش کے اصلی دشمنوں سے۔''

''ممتا اُن کو روکو۔ روی فوراً بولا۔ سوچو کن کو مارا جا رہا ہے اور کن کو بھگایا جا رہا ہے؟۔''

''وہ اب رُکیں گے نہیں کیونکہ اب وہ آگے نکل چکے ہیں۔''

''مر جائیں گے کیا پائیں گے؟۔''

''تم یہ نہ سوچو کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے؟۔''

''لیکن ممتا......؟۔''

''روی۔'' وہ درمیان میں ہی بولی۔ ''ساگر میں طوفان آتا ہے تو اُسے کوئی روک نہیں پاتا ہے۔ یہ تو انقلاب ہے۔ طوفان ہے۔ اس انقلاب کو لانے کے لیے تمہارے دوست نے بہت بڑی قربانی دی ہے۔''

''سو تو ہے ممتا لیکن اس انقلاب میں، میں وشال جیسے اور اپاہج پیدا ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' کیونکہ اُن میں سے شاید سب کو کوئی ممتا نہ ملے۔ سہارا دینے کے لیے۔ ممتا کچھ کرو۔ اُن کو روکو۔

''کیسے روک لوں۔''

''کچھ بھی کرو۔ ہاں، انجلی ماتھُر کو فون کرو۔ وہ اپنے باپ سے کہہ کر پولیس کی سختی کم کروا سکتی ہے۔''

وہ مسکرائی۔ روی کو اُس کی مسکراہٹ بہت بری لگی۔ وہ بولی۔ ''وہ دیکھو۔ ہجوم میں اُس نیلے سوٹ والی کو دیکھو۔''

روی ہجوم میں نیلے سوٹ والی لڑکی کو دیکھنے لگا لیکن اُس لڑکی کی پیٹھ اُن کی طرف تھی۔ وہ اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ روی نے پوچھا۔ کون ہے وہ؟۔''

''انجلی ماتھُر......؟'' وہ بھی اس جنگ میں شامل ہے۔ تم بھی اور میں بھی اس

جنگ میں شامل ہوں۔ یہ پورا شہر یہ جنگ لڑ رہا ہے۔ بتاؤ، کس کس کو روک لو گے؟۔''
تبھی پولیس کی جیپ یہ اعلان کرتی ہوئی اُن کے سامنے سے گزر گئی کہ پورے جمنا نگر میں کرفیو نافذ کر دی گئی ہے اور بلوا کرنے والوں کو دیکھتے ہی گولی مارنے کا حکم بھی صادر ہو گیا ہے۔ چاروں طرف کھلبلی سی مچ گئی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کی طرف دوڑنے لگے۔ بھرت پور اور دوسری بستیوں سے آئے ہوئے لوگ بھی اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے کسی نہ کسی جگہ پناہ تلاش کرنے لگے۔ اس افرا تفری میں بہت سے لوگ زخمی بھی ہو گئے اور بہت سارے گرفتار بھی ہو گئے۔ پورے شہر میں خاموشی سی چھا گئی۔

پاس کی چھاونی سے فوجیوں نے آ کر شہر کی سڑکوں پر مارچ کیا۔ اُن کے وزنی بوٹوں کی بھیانک آوازیں سب سے صرف یہی سوال پوچھ رہی تھیں کہ کیا آج اس زمانے کی بانر سینا آج کے راون، آج کے کھمبہ کرن اور آج کے میگھ ناتھ کو فنا کر سکے گی؟۔''



تھانے میں خاموشی سے بیٹھے وشال نے اوب کر گہری سوچوں میں ڈوبی ہوئی نیلما کی طرف دیکھا۔ بولا۔ ''کسی نئے ناول کا پلاٹ سوچ رہی ہو کیا؟۔''
اُس نے وشال کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔ بولی۔ ''حرج کیا ہے؟۔''
''ہاں'' پھر کوئی نیا انقلاب آ جائے گا۔''
''بُری بات ہے کیا؟۔''
''نہیں۔'' لیکن پھر کچھ لوگ سرکاری گولیوں سے مر جائیں گے۔ پھر کچھ لوگ پولیس کے ڈنڈے سہہ لیں گے اور پھر سب دیکھتے ہی دیکھتے گولی مارے جانے کا حکم سن کر مُردوں کی طرح اپنے اپنے گھروں میں پناہ لیں گے۔ باہر آنے کی اُن کی ہمت نہ ہو گی کیونکہ وہ جن کے خلاف انہوں نے آواز اُٹھائی ہے وہ اُن سے گِن گِن کر بدلہ لیں گے۔''

''ایک پہلو تم نے اس انقلاب کا دیکھ لیا۔ دوسرا نہیں دیکھا کیا؟''

''دوسرا کون سا؟''

''یہ کہ ہر دھرم اور ہر جاتی کے لوگ ایک ہو گئے ہیں۔''

''مگر فائدہ کیا ہوا؟''

''فائدہ ہوا ہے، بہت فائدہ ہوا ہے۔ نیلما بولی۔ ''کل شاید اسمبلی ٹوٹ جائے۔

''تم کو کس نے کہا''

''کچھ دیر پہلے پولیس کے کچھ افسر یہی گفتگو کر رہے تھے۔''

''اسمبلی کے ٹوٹ جانے سے کیا ہوگا؟''

گپتے اور موہن بابو جیسے لوگ پھر سے لوگوں سے ووٹ مانگنے میں شرم محسوس کریں گے اور اگر وہ پھر بھی لوگوں سے ووٹ مانگنے آئیں گے تو کوئی اُن کو ووٹ نہ دے گا بلکہ سب اُن کو دھتکار دیں گے۔''

وہ کچھ نہ بولا۔ نیلما بولی۔ میرے نئے ناول میں، میں اس بات کو بھی اچھالوں گی۔''

''دُنیا میں کہانیوں کی کمی نہیں ہے۔ نہ اُن کو پڑھنے والوں کی کمی ہے ہاں اُن کو لکھنے والوں کی کمی ضرور ہے۔ وہ نیلما کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے بولا۔ ''تم ضرور یہ کہانیاں لکھو۔ رات دن لکھو۔ تاکہ ہر مہینے کم از کم ایک انقلاب آجائے۔''

''تم بھی انقلاب آتے دیکھنا چاہتے ہو''

''میں ہمیشہ انقلاب کے حق میں رہا ہوں لیکن انقلاب آتے کیسے ہیں، مجھے معلوم نہ تھا۔ وہ دیکھو، وہ پولیس انسپکٹر آج میری طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر رہا ہے۔ اُس نے ایک پولیس انسپکٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، اور اُس دن اُس نے مجھ پر کتنے ظلم ڈھائے، مجھے معلوم ہے اور غصے میں مجھے گندے گندے نام بھی دیئے۔ تمہارے لائے ہوئے انقلاب سے اُس میں بھی تبدیلی آگئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ تبدیلی بہت لوگوں میں آئے گی۔''

''ممتا کے بارے میں کیا خیال ہے؟۔''

''ممتا کی یاد اس وقت کیسے آئی؟۔''

''ممتا میرے نئے ناول کے پلاٹ کا ایک حصہ ہے۔''

''کیوں؟۔''

''اس لیے کہ وہ پیار کا ایک پورا ساگر ہے۔ اتنی اچھی پوزیشن میں ہونے کے باوجود اُس نے تمہارا ساتھ نہ چھوڑا اور مجھے یقین ہے کہ بے چینی سے تمہارا راستہ دیکھ رہی ہوگی۔

''کیا پتہ......؟۔''

''وہ تمہارا راستہ دیکھ رہی ہوگی تب بھی ایک کہانی بنے گی۔ نہ بھی دیکھ رہی ہوگی تب بھی ایک کہانی بنے گی۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ ممتا کے تصور میں کھو گیا۔ نیلما نے اُس کے خیالوں کو توڑنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ ممتا کی یاد اور ممتا کا تصور ہی بہت ہے وشال کے لیے لیکن اندر ہی اندر ایک ہوک سی اُس کے دل سے اُٹھی کہ کاش اُس کے خیالوں میں اور اُس کے تصوّر میں وہ بھی بسی ہوتی۔ یہ درد اُس کے دل میں جاگ پڑا تو وشال سے ہٹ کر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ شام کو اُس نے ریڈیو سے خبر سُنی تو وہ خوشی سے پاگل ہوتے ہوتے بچی۔ اُس نے وشال کو آواز دی کہ ممتا کے خیالوں میں کھو کر اب شاید اونگھنے لگا تھا۔

''کہ...... کیا ہوا؟۔'' وشال نے آنکھیں کھول کر پوچھا۔

''انقلاب آیا ہے وشال انقلاب آیا ہے، وہ خوشی سے چہک کر بولی۔ جس انقلاب کی ہم نے آرزو کی تھی وہ انقلاب آ گیا ہے''۔

''لیکن کیا ہوا؟۔'' اُس نے فوراً پوچھا۔ کیا جمہوریت زندہ ہوگئی؟ کیا کسی نے بھگت سنگھ جی اور سکھدیو جی کو پھانسی کے تختہ دار سے زندہ اُتارا؟۔''

''وشال'' وہ فوراً بولی۔ ''وہ تو شہید ہوگئے تھے لیکن آج تین ہلاک ہوگئے ہیں۔

''تین ہلاک ہوگئے؟۔ ضرور اُن میں سے شودت کی بیوہ ایک ہوگی۔''

''نہیں۔''

''نہیں ...... پھر کون؟''

''ایک موہن بابو، ایک گپتا جی اور ایک نوین۔''

وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اُسے یقین ہی نہ آیا تھا۔

''ہاں'' نیلما پھر بولی۔ 'وہ ہلاک ہو گئے ہیں۔'

''کس نے مارا اُن کو؟''

''نہیں معلوم، ہاں نوجوان اپنے عزم کا لوہا منوا چکے ہیں۔ انقلاب آ گیا ہے۔

وہ تھوڑی دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور اُس کو اپنی آنکھوں سے لگا کر بولا۔ ''یہی ہیں نا وہ ہاتھ جو انقلاب لے آئے ہیں؟ اور تم ...... تم ......'' وہ بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ وہ نیلما کے ہاتھ کے سُہارے ہی نیچے جھک کر بولا۔ ''تم ٹالسٹائی سے بھی بڑی ہو۔ آج میں تمہارے پیر چھو لوں گا۔''

''نہیں ......'' وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ''ایسا غضب نہ کرنا۔ میں پاپی بن جاؤں گی۔ تم نہیں جانتے ہو کہ تم سے میں نے ......؟ وہ کہتے کہتے رُک گئی۔ ایک بار پھر اُس نے اپنے دل کو روکا۔ دل کی بات اُس نے وشال پر ظاہر نہ ہونے دی۔ بولی۔ ''تم آرام کرو۔ میں بھیا سے فون پر بات کر کے آتی ہوں۔''

ڈاکٹر راہول سے اُس کی بات نہ ہو سکی۔ نہ ممتا چلی آئی۔ رات وہ تھانے میں ہی رہے لیکن اگلی صبح تھانے میں اُس سے ملنے بہت سارے لوگ چلے آئے جن میں پولیس کمشنر ماتھر صاحب، اُن کی بیٹی ڈاکٹر انجلی ماتھر، روی اور ممتا کے پتا پروفیسر شام سندر بھی تھے۔ وہ دونوں ضمانت پر رہا ہو گئے۔ روی اُن کو وشال کے گھر میں لے گیا۔ جہاں ممتا اور بستی کے کچھ اور لوگوں نے پہلے ہی صفائی کی ہوئی تھی۔ چونکہ کرفیو میں ڈھیل دی گئی تھی اس لیے وشال کے گھر میں آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ وشال نے ممتا سے ملنا چاہا، اُس کی بانہوں میں چھپ کر رونا چاہا لیکن وہ ایسا بھی نہ سکا۔ بس چند پیغام ایک دوسرے کو وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں دے کر رہ گئے۔

مصروفیت سے ذرا فرصت پا کر اُس نے روی سے نیلما کو بُلایا لیکن نیلما کہیں بھی نہ ملی۔ بہت تلاش کے بعد بھی اُس کا پتہ نہ چل سکا لیکن شام کو وہ خود ہی چلی آئی۔

''تم کہاں گئی تھی۔'' وشال نے پوچھا۔

''گھر......؟''۔

''لیکن کہے پوچھے بغیر......؟''۔

''تم تک میں پہنچ نہ سکی تھی۔ اتنے لوگ جو گھر میں آئے تھے تم سے ملنے کے لیے۔ ہاں، وہ اپنے بیگ سے ایک لفافہ برآمد کر کے اُسے دیتے ہوئی بولی۔ یہ رکھ لو۔

''یہ کیا ہے؟''۔

''یہ تمہاری کہانی کی رائیلٹی Royalty ہے''۔

وشال منع کرتا رہا لیکن وہ ایک بھی نہ مانی۔ مجبوراً وشال نے وہ لفافہ لیا۔ تب نیلما نے اپنے بیگ سے دوسرا لفافہ نکال کر اُسے دیا۔'' بولی۔ ڈاک والا گھر پر دے گیا تھا۔

''کیا ہے یہ؟''۔

''تمہاری روٹی''۔

''میری روٹی......؟''۔

''ہاں۔ تمہاری نوکری کا آڈر ہے''۔

وشال کو یقین ہی نہ آیا۔ آنکھیں بھیگتی چلی گئیں۔ نیلما بولی۔ تم نے مجھے ممتا سے نہیں ملایا؟''۔

وشال نے اُسے ممتا سے ملایا۔ ممتا اُسے رُسوئی میں لے گئی جہاں وہ کھانا بنا رہی تھی۔ بہت دیر تک وہ آپس میں باتیں کرتی رہی۔ ممتا اُس کا احسان مان رہی تھی کہ اُس نے وشال کا اتنی دیر خیال رکھا اور نیلما اپنے اس درد کو ممتا سے چھپانے کی کوشش میں تھی کہ اتنی دیر وشال کو اپنے ساتھ رکھ کر بھی وہ وشال کو اپنا نہ بنا سکی۔

پھر جب وہ رسوئی سے باہر نکلیں تو نیلما نے جانے کی اجازت چاہی۔

''اتنی جلدی کیا ہے؟ وشال نے پوچھا۔''

''جلدی ہی ہے۔'' وہ بولی۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ ممتا تمہارا راستہ دیکھ رہی ہوگی تب بھی ایک کہانی بنے گی، نہ بھی دیکھ رہی ہوگی تب بھی ایک کہانی بنے گی۔''

''ہاں تو......؟۔''

بس کہانی بن گئی۔ میں اس پر کام شروع کرنا چاہتی ہوں۔''

''اب کس انقلاب پر تمہاری نظر ہے۔''

''عورت پر ہو رہے ظلم وستم کے خلاف آتا ہوا انقلاب دیکھنا چاہتی ہوں میں لیکن اس کے لیے بھی مجھے تمہاری مدد چاہیے ہوگی۔

''میری مدد......؟۔''

''ہاں'' میں تمہارے ذریعے شودت کی بیوہ تک پہنچنا چاہتی ہوں۔

''ضرور میں تمہیں اُس تک پہنچا دوں گا۔''

''گڈ لک Good Luck۔ وہ تیزی سے وہاں سے نکل گئی۔ وشال نے ممتا کی طرف دیکھا۔''

شرمائی سی وہ اُس کی بانہوں میں چھپ گئی۔ شکوہ کرتے ہوئے اُس نے پوچھا۔ مل گئی روٹی؟۔''

''ووٹی بھی مل گئی۔''

''ووٹی......؟۔''

''ہاں ووٹی، پنجابی میں گھر والی کو کہتے ہیں۔''

وہ اُس کی بانہوں میں جذب ہو کر رہ گئی۔ وشال کو لگا کہ وہ پھر سے مکمل ہو گیا ہے!!۔



مصنف

نام : اشوک کول

ولد : شری این این کول

ساکنہ : سویہ بگ، بڈگام

موجودہ سکونت : درگا نگر، جموں

فون : 2590390

Printed by : TFC Centre, Srinagar 2473818